مارچ 2008

قیمت : -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

[illegible] "مخدوم محی الدین — حیات اور کارنامے" (تاریخ 8، 9 اور 10 مارچ) [illegible]

جناب سدیپ بنرجی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی

پروفیسر بیگ احساس

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

پروفیسر لطف الرحمٰن

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

پروفیسر شمیم حنفی

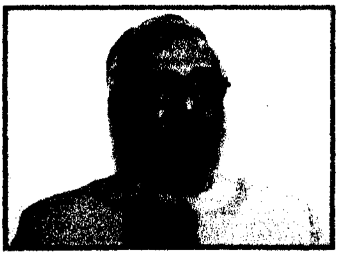

جناب مجتبیٰ حسین

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔3، مارچ 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657, 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 5

زبان و تعلیم

- اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمٰن فاروقی 6
- ایم۔اے۔ اردو ادب کا نصاب .... نصیر احمد خاں 8
- اردو—عالمی لسانی تناظر میں .... مشتاق احمد 11
- آن لائن تعلیم—مسائل اور امکانات .... دیوبرتا بسو/ الطاف انجم 13

ادب و ثقافت

- خزاں کے پہلے دن... (نظم) .... افتخار نسیم 15
- فن اور اخلاقیات—ارسطو کی نظر میں .... شرجیل احمد خاں 16
- علی گڑھ کی نمائش اور مشاعرہ .... اقبال محی الدین 18
- گوہاٹی اردو میلہ (رپورتاژ) .... شعیب رضا فاطمی 21
- کتنا عجیب .... مہیپ سنگھ/ خورشید عالم 29

شخصیات

- زین پیاژے .... سید اقبال امروہوی 33
- سرایڈمنڈ ہلیری—ایک عظیم مہم جو .... فیروز عالم 37

ماحولیات

- گھریلو دھواں .... عبدالباری مسعود 39

روبرو

- انتظار حسین سے گفتگو .... رشید انصاری 41

ہماری مطبوعات سے

- قوموں کی تقدیر .... خواجہ غلام السیدین 46
- حفظ صحت کا غذائی نظام .... احتشام الحق قریشی 50

اردو خبرنامہ .... ادارہ 54

تبصرہ و تعارف

- واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات .... ابوبکر عباد 70
- امریکی ادب کا مختصر جائزہ .... ابوفہیم خاں ....
- تاریخ آصفی .... ظفر احمد نظامی ....
- خفیہ کوڈ .... فیاض عالم ....
- سیتا ہرن کا تنقیدی جائزہ .... ظہیر رحمتی ....
- تمثیل نو (خصوصی شمارہ) .... فیروز عالم ....
- شام ہوتے ہی .... احمد کفیل ....
- گلہائے چمپا .... ابوظہیر ربانی ....

بچوں کا گوشہ

- سائنس کے فدائی .... عبدالودود انصاری 78

آپ کی بات

■ ساغر برنی، A-45، روڈ نمبر 7، پوسٹ آفس آزاد نگر، جمشید پور- 832110

دسمبر 2007 کا "اردو دنیا" پیش نظر ہے۔ سب سے پہلے جس مضمون پر نگاہ ٹھہری وہ شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "منظر کاظمی کے افسانے" ہے۔ منظر کاظمی کے فن کے حوالے سے یہ ایک اہم مضمون کہا جاسکتا ہے جو دوسرے ناقدین فن کو بھی دعوت فکر دیتا ہے۔ فاروقی نے لکھا ہے کہ منظر کاظمی بائیں بازو کی سیاست کے باعمل پیروکار تھے۔ لیکن وہ بائیں بازو کی سیاست کے باعمل پیروکار کبھی نہیں رہے۔ وہ صرف "انڈو سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی" کے ممبر تھے۔ نکسلائیٹ تحریک کے خلاف تھے۔ شہر کے چند لوگ جو اس تحریک سے وابستہ تھے ان میں صغیر صاحب، سید احمد شمیم صاحب، شمس فریدی صاحب اور یہ خاکسار ہے۔ یہ تمام لوگ ابھی بقید حیات ہیں اور میری بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

منظر کاظمی امریکی سامراجیت کے خلاف تھے۔ سیاسی تصورات اور نظریات سے وہ صرف کتابی دلچسپی رکھتے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ 1980 میں جب بہار اسمبلی کا الیکشن ہو رہا تھا تو اس میں انھوں نے C.P.I. کے امیدوار کامریڈ سلیل کر (SaleelKar) کے مقابلے میں کانگریس I کے امیدوار جناب شمس الدین خاں کی حمایت میں عملی حصہ لیا تھا۔ میرے اعتراض کرنے پر انھوں نے کہا تھا اس وقت نظریات نہیں قوم کا مسئلہ ہے، شمس الدین بھائی کو جتانا ہے۔"

■ الطاف انجم، شعبۂ اردو، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدرآباد- 500032

جنوری (2008) کے شمارے میں "جدید افریقی شاعری" کے تحت تیسری دنیا کی زبوں حالی اور تہذیبی محکومیت کا بے لاگ مگر دلآویز نقشہ کھینچا گیا ہے۔

"ڈاکٹر عبدالعلیم کی یاد میں" میں رفعت سروش صاحب نے حیدرآباد میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کو پہلی کل ہند کانفرنس (اردو) کہا ہے جبکہ یہ مذکورہ کانفرنس انجمن کی چوتھی کل ہند کانفرنس تھی۔ واوین میں اردو لکھنے سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ یہ کانفرنس صرف اور صرف اردو والوں کی کل ہند کانفرنس تھی۔ لیکن اس میں سروجنی نائیڈو، تاراچند جیسے دوسری زبانوں کے ادبا کے شریک ہوجانے کی وجہ سے اس کو گذشتہ کانفرنسوں سے مختلف اور ممیز کرکے پہلی کل ہند کانفرنس (اردو) نہیں کہہ سکتے۔ ہاں یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ مضمون نگار کے لیے پہلی کانفرنس رہی ہوگی جس میں وہ شریک ہوئے تھے۔

■ زبیر احمد بھاگلپوری، اردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ- 800015

"اردو دنیا" بروقت موصول ہو رہا ہے۔ "اردو دنیا" کے مطالعے سے اردو زبان و ادب کی توسیع و ترویج کے لیے قومی کونسل کے ذریعے کیے جا رہے اقدامات سے روشناس ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ فروغ اردو ادب کے نقطۂ نظر سے اسپھال، منی پور جیسی سخت اور سنگلاخ سرزمین میں بھی زبان و ثقافت کی اشاعت کی کاوش یقیناً لائق تحسین ہے۔ آپ لوگوں کی یہ کارکردگی اردو کی ترقیاتی تاریخ کے عہد زریں کی حیثیت سے یاد کی جائے گی۔

■ ایم نسیم اعظمی، ادیبہ پبلیکیشن، ڈومن پورہ، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

ماہنامہ "اردو دنیا" کا شمارہ بابت جنوری 2008 موصول ہوا۔ رسالہ حسب سابق قابل ستائش و توجہ ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس رسالے کے ذریعے بھی اردو کی بہترین خدمت انجام دے رہی ہے کیونکہ یہ رسالہ کم ازکم ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے جو تعلیم، زبان، ادب، کیریئر، ماحولیات اور صحت و سائنس سے متعلق نئے حالات سے ہم آہنگ ہر ماہ اپنے قارئین کو بہترین اور کارآمد مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو دنیا کی تازہ ترین خبروں اور سرگرمیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مستقبل کالم "اچھی اردو! روزمرہ، محاورہ، صرف" اردو طلبہ اساتذہ اور عام شائقین اردو زبان کے لیے کافی کارآمد ہے اسے بہرحال جاری رہنا چاہیے اور اس بارے میں رائے زنی کے دروازے بھی کھلے رہنے چاہئیں جیسی کہ ماہ دسمبر کے شمارے میں محترم راج بہادر گوڑ اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے مراسلوں سے تحریک ہوتی ہے۔ اس شمارے میں ڈی۔ پورن دیسوری کی تقریر کا اردو ترجمہ خوب ہے اس کے لیے جناب فیاض احمد وجیہہ قابل مبارکباد ہیں۔ رفعت سروش صاحب کا مضمون "ڈاکٹر عبدالعلیم کی یاد میں" کملیشور صاحب کا اردو ہندی کے بارے میں تازہ خیالی پر مبنی مضمون "ہندی اور اردو کی مشترکہ وراثت" (مترجمہ محمد عطا حسین انصاری) خاصے کی چیز ہیں۔ صغیر اشرف کا "جدید افریقی شاعری"۔ محترم سید حامد صاحب کا "گواسکر کا بیان"۔ اور جناب محمد خلیل صاحب کا مضمون "آلودگی اور درپیش مسائل" اقبال محی الدین کا "سائنس کی ترقی اور مائیکرو چپس" عظیم اقبال کا "سیارچے۔ خطرات اور امکانات"۔ عبدالعلیم قدوائی کا "اقلیتی طلبہ کی کوچنگ اسکیم" سمیت سبھی نگارشات کارآمد ہیں۔

■ ولیس راج سنگرا، شاہ آباد مارکنڈا ضلع، کوروکشیتر، ہریانہ

ہندوستان میں اردو زبان کی ترقی وفروغ کے لیے جو کام آپ کررہے ہیں۔ وہ قابلِ ستائش ہے۔ آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ آپ تو اردو ادب کے سمندر ہیں۔ آپ کی اور عزت مآب ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی گورنر ہریانہ کی دعاؤں سے ہریانہ میں اردو کی شمع جلائے ہوئے ہوں تو می یکجہتی کی جس زبان نے ہمیں آزادی دلوائی فروغ وارتقا کے لیے زندگی بھر کام کرتا رہوں گا۔

دعا کریں کہ دلوں کا غبار مٹ جائے
ہمارے دیش سے ہر انتشار مٹ جائے

■ محمد ناظم علی، صدر شعبہ اردو گری راج کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش

جنوری 2008 کا ''اردو دنیا'' بروقت موصول ہوا۔ یہ رسالہ نہ صرف اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں منہمک ہے بلکہ عصری دنیا کی مکمل تصویر کی عکاسی کررہا ہے۔ یہ اردو کے عصری ماحول کا نقیب رسالہ ہے۔ آفاقیت و عالم گیریت کے اس دور میں ایسے ہی رسالے کی ضرورت تھی۔ نالج سٹی و نالج سوسائٹی کے اس عہد میں یہ رسالہ ان تقاضوں کو پورا کررہا ہے۔ جس سے اردو ماحول استفادہ کرتے ہوئے نالج سٹی و نالج سوسائٹی کا ممبر بن سکے۔ الکٹرانک کلچر سے لکھنا پڑھنا کم ہوگیا ہے۔ ہر کوئی بصری کلچر کا شیدائی ہوگیا ہے اور کتب بینی متاثر ہوگئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ اپنی جیبوں میں پاکٹ سائز کے ناول یا رسالے رکھا کرتے تھے اور فرصت کے وقت نکال کر مطالعہ کرتے تھے۔ کہاں گیا وہ کتب بینی کا کلچر، کس کی نذر ہوگئی وہ عادتیں، طلبہ کے طبقے میں بھی مطالعہ کا عمومی شوق و ذوق ماند پڑ گیا وہ صرف امتحانی نقطۂ نظر سے نصابی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر ملک میں لکھنے پڑھنے اور مطالعے کے کلچر کا فقدان ہوجائے تو ملک فکری و تخلیقی بحران کا شکار ہوجائے گا۔ مدیرانہ تحریریں ملک کو ترقی عطا کرتی ہیں۔ جب مطالعے کی عادت نہ ہوگی تو تحریریں کیسے وجود میں آئیں گی۔ آپ کی بات میں جو تبصرے ومراسلے شائع ہوتے ہیں وہ فکر انگیز اور ادبی بصیرت کے حامل ہوتے ہیں ان میں بعض نئے نئے نکتے اور پہلو زبان و ادب کے نکل آتے ہیں۔ ہماری بات میں مدیر صاحب نے مشاعرے کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یقیناً آج کل معیاری مشاعرے کا فقدان ہے فوری اپیل کی شاعری سب کو بھاتی ہے جو بعد میں دیرپا اثر نہیں چھوڑتی۔ عصری دور کے مشاعروں میں فنی شاعری کم اور ترنم زیادہ ہوگیا ہے۔ اداریے میں یہ بات سچ اور صداقت پر مبنی ہے کہ مشاعرے کی صدارت پر وہ لوگ نظر آتے ہیں جو سیاسی منصب پر فائز ہوں، دولت مندیا ملک التجار ہوں۔ کسی علمی و ادبی شخصیت کو بہت کم صدارت سونپی جاتی ہے۔ مشاعرے زبان وادب کی وسعت اور عوام تک زبان پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ ڈی پورن دیشوری نے ''اردو شاعری پر میر کے اثرات'' کے ابتدا میں اردو زبان کی سرکاری حیثیت اور چلن پر فکر انگیز باتیں کی ہیں اور میر کی شاعری کو ہمارا قومی اثاثہ اور میراث سے تعبیر کیا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا کالم ''اچھی اردو: روزمرہ ،محاورہ، صرف'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اکابرین ومشاہیر ادب بڑی دلچسپی سے یہ کالم پڑھتے ہیں اور اپنے ادبی ولسانی شکوک وشبہات دور کرتے ہیں۔ رفعت سروش نے ''ڈاکٹر عبدالعلیم کی یاد میں'' ان سے وابستہ واقعات، حالات، سیرت اور شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔ جو اسلامیات کے ماہر، ترقی پسند دانش ور اور ادیب تھے۔ کملیشور صاحب نے ہندی اور اردو کی مشترکہ وراثت میں دونوں زبانوں کا لسانیاتی و تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا ہے لیکن موصوف نے یہ جملہ لکھ دیا ہے کہ اورنگ زیب کی بدنام زمانہ اسلام پرستی اور ثقافتی غیر فراخدلی بھی اس ثقافتی اشتراک کے عمل کو متاثر نہیں کرسکی۔ جو شخص مندروں اور پجاریوں کی مالی اعانت کرتا تھا تو وہ کیسے ثقافتی غیر فراخ دل ہوگیا۔ صغیر اشرف نے ''جدید افریقی شاعری'' میں افریقن شاعری و شاعر کے تعلق سے مضمون رقم کیا ہے جو انفرادیت کا حامل ہے۔ مہذب لوگ حبشیوں کو قابل اعتنا وقابل ذکر نہیں سمجھتے لیکن وہ لوگ بھی احساس وفکر کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ سید حامد نے گواسکر کے بیان کو مثالی بتلایا ہے اور معاشرے میں سچ اور تلخ حقائق کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ وقار صدیقی نے ''موگھیا قبائلی رسم ورواج'' مضمون میں قبائل کے رسم ورواج بیان کیے ہیں۔ جنوب میں بھی چنچو، گونڈ اور بھیل قبائل رہتے ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ فطری ماحول کو ترجیح دیتے ہیں۔ جنگل سے شہر میں نہیں آنا چاہتے، ان کی باتیں عجیب وغریب ہوتی ہیں وہ وہم اور Tabooism کا شکار رہتے ہیں۔ اس شمارے کے کالم صحت، سائنس اور ماحولیات کے تحت محمد خلیل کا ''آلودگی اور درپیش مسائل'' بہت عمدہ تخلیق ہے جو عصری دنیا کا سلگتا موضوع ومسئلہ ہے انھوں نے زمینی آلودگی، آبی آلودگی، فضائی آلودگی اور صوتی آلودگی پر فکر انگیز روشنی ڈالی ہے۔ اگر مذکورہ آلودگی کم نہ ہو تو انسانیت کی بقا مشکل ہوجائے گی۔ اقبال محی الدین نے ''سائنس کی ترقی اور مائیکرو چپس'' میں دنیا میں خاص کر ہند میں ہونے والی سائنسی ترقی کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے سبز انقلاب، سفید انقلاب، نیلا انقلاب اور کئی ترقیاتی اقدامات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سلیم اختر سے بات چیت پسند آئی انھوں نے نفسیات اور ادب کے رشتے اور اردو میں تنقید کی سمت

در فتار پر روشنی ڈالی ہے۔ باقی مشمولات بھی افادیت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اردو دنیا کا قاری اس رسالے سے کما حقہ استفادہ کرے تو عصری دنیا میں مقام بنا پائے گا۔

■ اختر یوسف، سری اورووند نگر، ڈورنڈہ، رانچی۔ 834002

''اردو دنیا'' حاصل ہوتا ہے۔ محکمہ ڈاک کی مہربانی سے کبھی نہیں بھی ملتا ہے۔ دسمبر 2007 کے شمارے سے محروم رہا۔ جنوری 2008 کے شمارے میں میر پر ڈی پورن ویسوری کا مضمون دیکھا تو معلوم ہوا کہ امپھال میں میر پر قومی کونسل کا سیمینار منعقد ہوا تھا۔ جس کی تفصیلی رپورٹ دسمبر 2007 کے شمارے میں آئی تھی۔ ادھر گوہاٹی میں کونسل نے کتاب میلہ لگایا۔ کچھ نہیں تو اردو کتابیں اپنے قوس قزحی جلوؤں سے ہی غیر اردو والوں کے ذہن میں اپنی بابت سوچ کی کوئی نہ کوئی کرن تو ضرور پیدا کریں گی۔ آپ کی محنت اور لگن یقیناً کونسل کو مزید آگے لے جائے گی۔

شمارہ جنوری 2008 بدستور اپنے مخصوص مزاج اور رنگ کا نمائندہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ''اچھی اردو، روز مرہ'' ایک نہایت کارآمد صفحہ ہے۔ رفعت سروش صاحب کا مضمون ''ڈاکٹر عبدالعلیم کی یاد میں'' علیم صاحب کے رتبے کا روشن اعتراف ہے۔ اس میں کیا شک کہ اپنے قبیلے میں علیم صاحب سب سے اونچے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ علیم صاحب کی شخصیت ان کے اپنے قبیلے کے مزاج سے بہت آگے نکلی ہوئی تھی۔ □□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ہماری بات

مخدوم محی الدین اپنے عہد کے مقبول ترین شاعروں میں بھی تھے اور ایک ہردلعزیز سیاسی راہ نما بھی۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ شاعر بالعموم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ زندگی کو خوشگوار اور خوشحال بنانے کے خواب تو دیکھتے رہتے ہیں مگر ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے عملاً کچھ نہیں کرتے۔ اس خیال میں تھوڑی بہت صداقت بھی ہے مگر اسے ایک کلیہ بنا کر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ عالمی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جب دانشوروں اور فنکاروں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے عملی جدوجہد کی اور اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں۔ خود ہمارے ملک اور ہمارے زمانے میں بھی یہ مثالیں نایاب نہیں۔ اس کی ایک مثال مخدوم بھی ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کی بہتری کے خواب ہی نہیں دیکھے، ان خوابوں کو اپنی صوابدید کے مطابق تعبیر بھی دینا چاہی اور اس کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے۔ اپنے خیالوں میں آباد دنیا کو وہ حقیقی دنیا کے روپ میں دیکھنے کے دل سے آرزومند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے سماج میں مختلف سطحوں پر جو خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں انھیں ختم کیا جائے اور ایک مبنی برانصاف نظام قائم کیا جائے۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کا ہر خاندان اور ہر خاندان کا ہر فرد وہ سب کچھ پائے جو اس کا جمہوری حق ہے اور ساتھ ہی ہر شخص اپنے ان فرائض کو بھی ادا کرے جو سماج کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ خوشگوار اور خوشحال زندگی کا خواب اسی صورت میں شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے جب سماج کے ہر فرد کو اپنے حقوق اور فرائض کا یکساں احساس اور پاس ہو۔ مخدوم ملک کی ایک اہم سیاسی جماعت کے سرگرم کارکن ہی نہیں، اس کے سربرآوردہ رہنماؤں میں بھی تھے۔ انھوں نے اپنی پارٹی کے پلیٹ فارم سے مزدوروں، کسانوں اور دوسرے ان سبھی لوگوں کے حق میں آواز بلند کی جو استحصال کا شکار تھے۔ ان کی آواز میں سچائی تھی، خلوص تھا، اسی لیے اثر بھی تھا۔ ہزاروں لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور وہ آنے والے کل کی بہتری کی جدوجہد میں ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے پر تیار ہوگئے۔ عصری سیاست کو یہ ان کی معمولی دین نہیں تھی۔ مخدوم کی ہردلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی طور پر ان کے ہم خیال تو ان کے گرویدہ تھے ہی، جو لوگ ان سے سیاسی اختلاف رکھتے تھے ان کا رویّہ بھی ان کے لیے محبت اور احترام کا تھا۔

سیاسی مصروفیتوں نے، اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع مخدوم کو کم کم دیا لیکن ان کی پہلی پہچان ایک شاعر ہی کی تھی اور ان کی ہردلعزیزی میں زیادہ دخل شاید ان کی شاعری ہی کا تھا۔ وہ دنیا اور اس کے علائق کے ساتھ ساتھ دل کے معاملات سے بھی گہرا سروکار رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں، خواہ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں، جو درد، جو کسک اور جو دردمندی ملتی ہے، وہ دل کے راستے ہی سے آئی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خوش اندام کی پرچھائیاں صاف چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، جو ان کے دل کا مکیں ہے۔ یوں تو ان کی پوری شاعری لطف ولذت سے معمور ہے لیکن ان کی عشقیہ شاعری میں لطیف جذبات اور نازک کیفیات کا وفور ہے۔ اگر ایک طرف حسن بے پروا خرام کی صبر آزما ادائیں ہیں تو دوسری طرف عشق ناشکیبا کی بے قراریاں جیب و گریباں سے الجھتی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کے سیاسی خیالات کا اظہار اس طرح کے اشعار میں ہوا ہے:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

جو عالم انسانیت کو زندگی اور آدمی کی بہتری کے لیے اتحاد اور اتفاق کے ایک مرکز پر جمع ہوجانے کی دعوت دیتے ہیں تو ان کے جمالیاتی احساس کو ان کے اس نوع کے اشعار نے زبان دی ہے:

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

مخدوم نے ایک جگہ لکھا ہے:

"شاعر بہ حیثیت معاشرے کے ایک فرد کے، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر ہوتا رہتا ہے، پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ رومانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے، شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر خارجی عالم میں واپس آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہوکر ہم کلام ہو۔"

مخدوم کے یہ الفاظ ان کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے شاعرانہ مزاج کی بڑی خوبی سے وضاحت کرتے ہیں۔

یہ خیالات وزارت فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ کے ہیں جن کا اظہار انھوں نے اپنے اس صدارتی خطبے میں کیا ہے جو انھیں 8 فروری کو سہ روزہ مخدوم سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں پڑھنا تھا۔ اس سیمینار کا اہتمام قومی اردو کونسل نے مخدوم کی سوویں سالگرہ پر کیا تھا۔ جناب ارجن سنگھ اپنی کسی دوسری ناگزیر مصروفیت کی وجہ سے جس کی اطلاع انھیں اچانک ملی، جلسہ گاہ میں تشریف نہ لاسکے، ان کی غیر موجودگی میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے یہ خطبہ پڑھ کر سنایا جس کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا۔ سیمینار کی رپورٹ اور کچھ تصویریں اسی شمارے میں شائع کی جارہی ہیں۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: عنائت، درائت، روائت وغیرہ الفاظ میں ہمزہ اصولی اعتبار سے الف کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن انھیں الفاظ کے املا کو تحتانی کے ساتھ (عنایت وغیرہ) بھی درست قرار دیا گیا ہے۔

جواب: عنایت، درایت، روایت وغیرہ الفاظ میں ہمزہ ہے ہی نہیں، تحتانی ہے۔ ان اور ان جیسے الفاظ کا املا مع ہمزہ کرنا (مثلاً عنائت وغیرہ) بالکل غلط اور رواج عام کے بالکل خلاف ہے۔

سوال: اردو میں ہمزہ کے اعداد کیا ہوں گے؟ اس سلسلے میں بڑا انتشار ہے۔

جواب: یہ سوال میرے موضوع سے خارج ہے لیکن اس کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔ میرے خیال میں ہمزہ کا عدد (ایک) ماننا چاہیے۔ اس کی وجہ بھی میں بیان کر چکا ہوں۔ لیکن اس وقت مختلف لوگ اپنے اپنے طور پر عمل کرتے ہیں۔

سوال: بہت سے عربی الفاظ کے آخر میں ہمزہ ہے، جیسے ملجاء، دعاء، فضاء وغیرہ۔ لیکن اردو فارسی میں اس ہمزہ کو شامل املا نہیں کرتے۔ کیوں؟ اور ایسی صورت میں ''جاء نماز'' وغیرہ جیسے الفاظ کا کیا ہوگا؟ یہاں ہمزہ کی عددی حیثیت باعث دردسر ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ کہ ''جا'' بمعنی ''جگہ'' عربی نہیں ہے، فارسی ہے۔ اس کے آخر میں ہمزہ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا ''جاء نماز'' نہ کوئی لکھتا ہے نہ لکھنا چاہیے۔ رہا سوال ہمزۂ اصلی والے عربی الفاظ، مثلاً دعاء، ملجاء، وغیرہ کا تو اردو فارسی میں اس طرح کے ہمزہ کو شامل قافیہ نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی اسے لکھا جاتا ہے۔ (آج کل بعض اردو والے محض بلاوجہ لکھنے لگے ہیں اور میں نے اس کے خلاف بار بار عرض بھی کیا ہے۔) اگر ایسے الف والے لفظ کو مرکب کرنا ہو تو دونوں لفظوں کے بیچ میں بڑی یے ڈال دیتے ہیں: دعائے صباح؛ ملجائے انسان، وغیرہ۔

(سوالات از سید مظہر الحق، کانٹاٹولی، رانچی)

سوال: آپ کا دلچسپ اور مفید کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' پڑھا۔ ایک جگہ آپ نے لکھا ہے، ''چونکہ اردو میں لفظ ساکن سے شروع نہیں ہوسکتا۔'' میرے خیال میں یہ محل نظر ہے۔ اردو میں بعض ہندی نژاد لفظ ساکن سے شروع ہوتے ہیں، جیسے پیار، پیاس، پیاز۔ ان لفظوں میں پ ساکن اور ی مفتوح ہے اور عروضی لحاظ سے ان کا وزن پار، پاس، پاز، ہوگا۔

جواب: میں جناب ڈاکٹر عبدالرحیم کا شکرگزار ہوں۔ مجھے کہنا چاہیے تھا، ''چونکہ اردو عروض کی رو سے کوئی لفظ ساکن سے شروع نہیں ہوسکتا...'' بحث عروض کے ایک مسئلے پر تھی، لہٰذا میرا جواب عروض ہی کے حوالے سے تھا۔ پھر بھی، مجھے بات کو مزید واضح کر دینا چاہیے تھا۔ برسبیل تذکرہ، ''پیاز'' کو بروزن فعول بھی باندھتے ہیں، اگرچہ عموماً اس کا حرف اول ساکن ہی بولا جاتا ہے۔

(سوال از ڈی۔ عبدالرحیم، مدیر مرکز الترجمات، مدینہ منورہ)

سوال: اردو کا مشہور مصرع ہے:

جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

کیا یہ رباعی کا مصرع ہے؟ اور یہ رباعی کیا مولانا حالی کی ہے؟

جواب: اس سوال کا اردو صرف و نحو سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال جواب یہ ہے کہ یہ رباعی ہی کا مصرع ہے۔ اس کے مصنف میر انیس ہیں۔ پوری رباعی حسب ذیل ہے:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی\
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی\
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا\
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

سوال: ''براہ کرم'' صحیح ہے یا ''برائے کرم''؟

جواب: اس کا جواب میں بہت پہلے عرض کر چکا ہوں۔ دونوں صحیح ہیں۔

(سوالات از کے۔ اے۔ زرتاب، پاگل کوٹ)

سوال: ''دیوانہ'' کو'' دوانہ'' کیوں لکھیں جب روزمرّہ میں'' دیوانہ'' ہے۔

جواب: لفظ'' دوانہ'' دراصل'' دیوانہ'' ہی ہے۔ پرانے زمانے میں اس کا تلفظ اور املا'' دوانہ/ دوانا'' بھی تھا۔ اب نہیں ہے اور اب'' دوانہ'' لکھنا یا بولنا غلط ہے۔

سوال: روزمرہ کی پہچان کیسے کی جائے گی؟ ہر دور میں روزمرہ الفاظ موجود تھے۔ کل بھی روزمرہ الفاظ تھے، اور آج بھی ہیں۔

جواب: آپ نے اپنے سوال کا خود جواب دے لیا۔ جو لفظ جس طرح عام پڑھے لکھوں کے استعمال میں ہے، وہی روزمرہ ہے۔ بولنے والا خود بتادے گا کہ فلاں لفظ روزمرّہ کے خلاف ہے۔'' دیوانہ/ دوانہ/ دوانا'' کے بارے میں آپ کا سوال بھی اسی بات کو ظاہر کر رہا ہے۔

جناب والا۔ آپ کے اکثر سوالات میرے موضوع سے خارج ہوتے ہیں۔ میں حتی الامکان جواب لکھ دیتا ہوں۔ اب سے مجھے معاف رکھیں۔

(سوالات از محمد ناظم علی، نظام آباد)

□□□

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نصیر احمد خاں

ایم. اے. اردو ادب کا نصاب
چند معروضات

اردو زبان و ادب کے نصابوں پر بہت کم نظرثانی ہوئی ہے۔ ہم اکثر برٹش انڈیا کی دی ہوئی سوچ سے متاثر نصابوں سے کام چلا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو تنقید کو لیجیے، ہم نے اپنے فن پاروں کو پرکھنے کے لیے بیشتر مغربی پیمانے مقرر کیے ہیں۔ جبکہ ہمارا سماج مغربی سماج سے مختلف ہے۔ اس لیے ہم وہ نہیں سوچ اور سمجھ پائے جو ہمیں اپنے مشرقی سیاق میں رہ کر سوچنا اور سمجھنا چاہیے۔ مثال داستانوں سے لیجیے جو ہماری تہذیب کی عکاس ہیں۔ ہم نے مغربی سوچ کے زیر اثر یہ کہہ کر انھیں رد کر دیا کہ ان میں مافوق الفطرت عناصر ہوتے ہیں اور وہ حقیقی زندگی سے دور ہوتی ہیں لیکن آج ہیری پوٹر کی مغرب میں دھوم ہے جو مافوق الفطرت عناصر سے بھری پڑی ہے۔ ہم کیا پڑھنا چاہتے ہیں اور کیوں پڑھنا چاہتے ہیں؟ یہ دونوں باتیں ہماری سماجی زندگی کی ضرورتوں کے ''تابع'' ہیں اور ان مقاصد سے جڑی ہوئی ہیں جن کے تحت ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ایم. اے. اردو ادب کے نصاب کی بحث کو ہم پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی شاعری، نثر، تنقید، تاریخ اور زبان شاعری اور نثر کے نصاب میں فنکار کے تخلیقی عمل میں عہد بہ عہد تبدیلیوں کا جائزہ، متن کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ، شاعر یا ادیب کی انفرادیت اور شناخت اہم ہیں۔ یہاں متن کی تفہیم پر خاص زور ہونا چاہیے۔ تنقید کے پرچے میں تنقید نگاروں کی فکری اساس، تنقیدی شعور، رجحانات و میلانات کے علاوہ نظریے موضوع بحث بنتے ہیں جو ادب کو سلجھنے، پرکھنے اور فن پارے سے محظوظ ہونے میں معاونت کریں۔ تاریخ ادب میں ادب کو مختلف ادوار میں بانٹ کر سماجی و تہذیبی پس منظر میں ادبی سرمایے کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ادب میں تبدیلیاں لانے والے اداروں، رجحانوں اور تحریکوں سے بحث ہوتی ہے اور اصناف کا ارتقا اور فن اور فنکار کی شناخت کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ نصاب کے ایک پرچے میں زبان کی تاریخ کی بحث بھی ناگزیر ہے جس میں زبان کی ابتدا، ارتقا اور تشکیل، لسانی ساخت کے بنیادی عناصر، لسانی معیار اور لسانی رشتوں کا ذکر ہونا لازمی ہے۔

نصاب میں علاقے کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔ ہر علاقے کے ادب کو اس علاقے کے اردو نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر بنگال کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایم. اے. اردو ادب کے نصاب میں بنگالی زبان و ادب کا پرچہ ضرور شامل ہونا چاہیے جو اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرے اور اس میں بنگالی کے کلاسیکی ادب کی خصوصیات و امتیازات اور ادبی رجحانات و میلانات کا بھی ذکر ہو اور وہ اردو اور بنگالی کے علاقائی رشتوں کی وضاحت کرے۔ نصاب میں Job Oriented کورسوں کی شمولیت بھی ضروری ہے، یعنی ایسے کورس جو اردو ادب میں ایم. اے. کرنے کے بعد نوکری دلانے میں مدد کریں یا جیسے ترسیلی نثر ماس میڈیا، ترجمے کا فن، زبان و قواعد کے اصول، زبان و ادب کی درس و تدریس پر مہارت وغیرہ۔ پہلی اور دوسری زبان پڑھانے کے طریق کار پر بھی کوئی کورس ہو سکتا ہے۔ لسانی استعداد سے متعلق بھی ایک ایسا کورس ہونا چاہیے جو زبان کے لسانی پہلوؤں پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صحت مند نصاب وہ ہے جو عصری تقاضوں کو پورا کرے، ادبی فن پارے سے محظوظ ہونے کا شعور پیدا کرے، تقابلی اور تجزیاتی مطالعے کی صلاحیت کو فروغ دے۔ نوکری فراہم کرنے میں مدد دے، علاقائی اکائیوں سے جوڑے، ادب کو سماجی سیاق میں دیکھے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی اساس متن کی تفہیم پر ہو۔ ان نکات کی روشنی میں اگر ہم اپنے موجودہ نصاب پر نظر ڈالیں تو اس میں متعدد کوتاہیاں نظر آئیں گی۔ مثلاً:

(1) نصاب کا صرف بیس سے پچیس فی صد حصہ متن کے لیے وقف ہے

(2) نصاب کے Content میں تکرار بہت ہے

(3) نصاب عصری تقاضوں کو پورا نہیں کرتا

(4) نصاب میں ادب سے محظوظ ہونے کی تربیت نہیں ملتی

(5) نصاب میں علاقائی عوامل کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا

(6) نصاب میں تنقیدی شعور کی تربیت مغربی پیمانوں سے کی جاتی ہے

(7) نصاب میں ادب کو سماجی سیاق میں سمجھنے کی کوشش نہیں ملتی

(8) نصاب میں تقابلی مطالعے کا فقدان ہے

(9) نصاب جدید تحقیق سے محروم ہے

(10) نصاب روزگار کے مواقع فراہم نہیں کرتا اور

(11) نصاب میں مجری ادب، ادبِ اطفال اور جاسوسی کی ادب کے حوالے نہیں ملتے

ایم. اے. اردو ادب کے نصاب کا خاکہ پیش کرنے سے پہلے درس و تدریس اور استعداد و مہارت کی جانچ کرنے کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنے کی

اجازت چاہتا ہوں۔ ادب کی درس و تدریس کے سلسلے میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

(1) موضوع کا تعارف کرانا اور اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنا

(2) موضوع سے متعلق ایسی بنیادی کتب کی فہرست تیار کر کے طلبہ کو فراہم کرنا جو ان کے مطالعے کے لیے لازمی ہوں

(3) ایسے مختصر نوٹ تیار کر کے طلبہ میں تقسیم کرنا جو موضوع سے متعلق بنیادی معلومات پیش کریں

(4) متن کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

(5) مصنف کا تعارف اور ان کے عہد کے سماجی تحرکات کا مطالعہ

(6) شاعر یا ادیب کی انفرادیت کے عناصر کا تجزیہ

(7) اسلوب کی شناخت کے لسانی پہلو کی توضیحات، اور

(8) کلاس میں سوال و جواب کے سلسلے کو قائم رکھنا۔ وغیرہ

جہاں تک طالب علم کی استعداد و مہارت کی جانچ کا تعلق ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی درمیانی وقفوں میں جانچ اور تعلیمی سال کے اختتام کا امتحان یا جانچ۔ درمیانی وقفے میں جانچ کے مزید تین حصے ہو سکتے ہیں:

(1) کلاس ٹیسٹ لینا: پڑھائے گئے مضامین میں سے کسی ایک موضوع کو لے کر کلاس ٹیسٹ لینا، (2) سیمینار پرچہ لکھوانا: پڑھائے گئے موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر پرچے لکھوا کر طالب علموں سے انھیں فرداً فرداً کلاس روم میں پیش کروانا، (3) تعلیمی سال کے اندر ایک یا دو مقالے لکھوانا۔ پڑھائے گئے موضوعات میں سے کسی ایک یا دو موضوعات پر مقالے لکھوانا۔ اس کے لیے طالب علم سے پہلے کتابیات تیار کرائی جائے اور اس کے بعد مقالے کا خاکہ تیار کروایا جائے۔ معینہ وقفے میں مقالہ جمع کرنے کی تاکید کرنا۔ طالب علم کو مقالے میں پانچ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنا، اپنی بات کو استدلال کے ساتھ پیش کرنا، مقالے میں تجزیاتی فکر کو غالب رکھنا، خیالات میں منطقی ربط قائم رکھنا اور نتائج اخذ کر کے اپنی رائے پیش کرنا وغیرہ۔

تعلیمی سال کے اختتام کی جانچ میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

(1) سوالات معروضی قسم کے ہوں، (2) سوالات مختصر اور طویل دونوں طرح کے ہوں، (3) سوالات کی نوعیتوں میں فکری اساس اور فنی محاسن دونوں شامل ہوں، (4) سوالات فنکار کی شناخت اور اس کے کارناموں سے متعلق ہوں، (5) سوالات طالب علم کی معلومات کا اندازہ لگانے والے ہوں، (6) سوالات طالب علم کے تنقیدی اور تجزیاتی شعور کا پتہ لگائیں، (7) سوالات طالب علم کی لسانی گرفت کو پرکھیں،

ایم۔ اے۔ اردو ادب کے نصاب کو ہم تین حصوں میں بانٹ سکتے ہیں: لازمی مضامین، اختیاری مضامین اور اضافی مضامین۔ ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کل 16 کورسیز کرنے ہوتے ہیں جن میں سے 12 لازمی اور 4 اختیاری کورسوں کے علاوہ طالب علم اپنی استعداد اور دلچسپی کے مطابق ایک، دو یا تین اضافی کورسیز بھی کر سکتا ہے جنھیں دوران تعلیم مکمل کرنا ہوگا۔ ذیل میں کورسیز کی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

شاعری: (1) کلاسیکی اردو شاعری، (2) قدیم اردو شاعری، (3) جدید اردو شاعری

نثر: (4) قدیم اور کلاسیکی نثر، (5) اردو ناول اور افسانہ، (6) غیر افسانوی نثر: سوانح نگاری، خطوط نگاری، انشائیہ، مضمون، طنز و مزاح، سیرت نگاری۔

تنقید: (7) مشرقی و مغربی تنقیدی نظریات: فارسی، عربی، سنسکرت نظریات، رومانی شعریات، شکاگو اسکول، روسی ہیئت پسندی، فرانسیسی ساختیت، اسلوبیات، (8) اردو تنقید اور تنقید نگار

تاریخ: (9) تاریخ اردو ادب I، 1857 سے قبل تاریخ ادب کی تعریف، اردو کی ادبی تاریخیں، ابتدائی دور، دکنی ادب کا ارتقا، اصناف کا ارتقا، نثر کا ارتقا، دلی اور لکھنؤ کا تہذیبی و سیاسی پس منظر اور ادبی سرمایہ، دلی کالج، (10) تاریخ اردو ادب II، 1857 سے تا حال: 1857 کی مزاحمت اور اس کے نتائج، سیاسی و سماجی تحریکات (سرسید سے ترقی پسند تحریک تک)، اصناف نظم و نثر کا ارتقا، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت کا رجحان، (11) تاریخ زبان اردو: ابتدا و ارتقا، ہند آریائی زبانوں کا ارتقا، اردو کی ابتدا سے متعلق نظریات، اردو کے غیر ہند آریائی زبانوں سے رشتے، زبان کی اصلاح کی تحریکیں، مشترکہ تہذیب اور اودھ، اردو کی انفرادیت، اردو ساخت کے بنیادی پہلو۔ (12) مقامی زبان و ادب کا اجمالی خاکہ، زبان کی تاریخ کے مختلف ادوار، اصناف کا ارتقا، کلاسیکی ادب، نمائندہ فنکار۔

اختیاری پرچوں کے موضوعات: حسب ذیل پرچوں میں سے ڈگری کے لیے چار موضوعات کا انتخاب لازمی ہے۔

(13) ادب کی جدید مغربی تحریکیں، رومانوی شعریات، میتھو آرنلڈ کے نظریات، آئی۔ اے۔ رچرڈز اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نظریات، امریکہ کے نئے نقاد اور شکاگو اسکول، روسی ہیئت پسندی، فرانسیسی ساختیت اور ادبی اسلوبیات، (14) کسی ایک ادیب یا شاعر کا تفصیلی مطالعہ، (15) فارسی زبان و ادب، فارسی زبان و قواعد کی مبادیات، فارسی ادب کی تاریخ کا خاکہ، فارسی کے اہم شعرا اور نثر نگار، اردو ادب پر فارسی کے اثرات، (16) اردو کی شعری اصناف کا ارتقا، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، نظم، رباعی، (17) ترجمے کا فن اور روایت، اردو میں ترجمے کی روایت، ترجمے کے مختلف نظریے، ترجمے کے اقسام، اصطلاحیں وضع کرنے کے اصول، تخلیقی اور کاروباری ادب کا ترجمہ، نثر اور

شاعری کے درمیان ترجمے میں تفریق کی نوعیت،(18) اردو صحافت، ترسیل، نظریہ اور عمل، بین ثقافتی ترسیل، عالمی معلومات عامہ کا نظام، اردو صحافت کی تاریخ، پیش کش، رپورٹ تیار کرنے کی مبادیات، انٹرویو، رائے عامہ کا ذکر وغیرہ ، برقی صحافت کے اصول، اشتہارات، اداریہ، کالم نویسی اور مراسلہ نگاری،(19) اردو ڈراما اور اسٹیج:(20) اردو کے سماجی ادارے، قوالی، چہار بیت، مجرے، داستان گوئی، غزل گائیکی، مرثیہ خوانی،(21) اردو کا ہجری ادب: ہجری ادب کیا ہے؟ اردو کا ہجری ادب: اسباب و محرکات، ہجری ادب کے موضوعات،(22) ادب کی سماجیات: ادب کے سماجی مطالعے کی تعریف، ادبی مطالعے کے سماجیاتی نظریے،(23) تقابلی ادب: اصول و نظریات، (24) متنی تنقید کے اصول،(25) دکنی زبان و ادب،(26) بچوں کا ادب، (27) جاسوسی ادب،(28) اسکرپٹ رائیٹنگ،(29) برقی میڈیا اور اردو۔

اضافی پرچوں کے موضوعات: حسب ذیل پرچوں کی حیثیت ذیلی ہے۔ ان کا شمار ڈگری کے لیے 16 پرچوں سے الگ ہوگا:

(30) اردو کمپیوٹر کورس،(31) ایڈیٹنگ، کمپائیلنگ اور پروف ریڈنگ، (32) پرنٹنگ اور پبلشنگ کے اصول،(33) کتابوں کی خرید و فروخت کے اصول(34) ترسیلی اردو اور شارٹ ہینڈ۔

□□□

پتہ:
Emirates Fellow
(University Grants Commission)
JNU, New Delhi

نشاط روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس/ مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مشتاق احمد

اردو — عالمی لسانی تناظر میں

اکیسویں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ جدید ایجادات اور جدید دریافتوں کے سبب روز نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سائنسی انکشافات، دریافتیں ابھی اپنی آخری منزل کو نہیں پہنچی ہیں۔ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی نے انسان کی زندگی کے تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جینے کے طریقے بدلیں گے تو اس تبدیلی سے تہذیب اور زبان بھی لازمی طور پر متاثر ہوگی۔ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ عالمی گاؤں کے پھیلتے ہوئے بازار میں چند زبانوں کی اجارہ داری قائم ہو رہی ہے اور علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ کئی بڑی زبانوں کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اکیسویں صدی میں دنیا کی نوے فیصد زبانیں اور بولیاں معدوم ہو سکتی ہیں۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 2500 سے زیادہ زبانیں اور بولیاں اپنا وجود کھونے والی ہیں جبکہ 234 زبانیں ختم ہو چکی ہیں۔ کچھ اسی طرح کا خدشہ معروف ادیب نرائن گنیش نے اپنے ایک مضمون "Speech is part of our cultural identity" مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا مورخہ 3 جنوری 2007 میں ظاہر کیا ہے کہ "عالمیت کی وجہ سے 3450 زبانیں اپنا وجود کھونے والی ہیں۔" ایک ماہر لسانیات ڈاکٹر اروند کالا کا خیال ہے کہ "آج دنیا میں 6500-6800 زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں سے زیادہ تر زبانیں اپنا وجود کھونے جا رہی ہیں کیوں کہ ہر دو ہفتے پر ایک زبان مر رہی ہے۔ اس طرح سے حال اور مستقبل میں درجنوں ہندوستانی زبانیں بھی اپنا وجود کھو دیں گی۔"

کچھ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ اس صدی کے آخر تک پوری دنیا میں صرف ایک درجن زبانیں ہی زندہ رہ پائیں گی۔ جاپان میں بین الاقوامی لسانی کانفرنس (1995) میں ماہرین نے اپنے ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا تھا کہ دنیا کی 6760 معروف زبانوں میں 234 زبانیں دم توڑ چکی ہیں اور اگر ہم زبانوں کے تحفظ کے تئیں سنجیدہ نہیں ہوئے تو آنے والی صدی میں یہ اوسط بڑھ سکتا ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے تو یونیسکو سے جاری لسانی نقشے میں 1996 میں ملک کی 1600 سے زیادہ زبانوں اور بولیوں کو خطرے کے دائرے میں رکھا گیا ہے۔

زبان صرف ذریعۂ اظہار ہی نہیں ہے بلکہ زندگی جینے کا پیمانہ بھی ہے۔ کسی زبان کو قبول کرنے کا مطلب ہے اس کی روایت، فکر اور تہذیب کو قبول کرنا۔ جیسا کہ فشمین نے کہا ہے:

"زبان محض تبادلۂ خیال کا ذریعہ نہیں، نہ ہی مختلف خیالات، احساسات، نظریات کی، خواہ پوشیدہ ہوں یا واضح ترجمانی کا وسیلہ بلکہ زبان خود ایک مکمل مواد کی حیثیت رکھتی ہے، باقاعدہ طور پر سماج کی عکاس ہوتی ہے اور عوام کی معاشرتی حیثیت اور تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ زبان کے ذریعے مختلف حالات اور سماجی اقدار ظاہر ہوتی ہیں۔"

اس حقیقت کی طرف اردو کے ایک ماہر زبان معین الدین نے بھی خوب اشارہ کیا ہے:

"زبان ترسیل خیال کا ایک اہم وسیلہ ہے اور زبان اور فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے ذریعے انسان کے شعور کی تربیت ہوتی ہے اور تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ زبان کے وسیلے سے ہی انسان گرد و پیش کے ٹھوس حقائق کو تصورات کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور تخیلات کی دنیا آباد کرتا ہے۔ اس کے ذریعے تجزیاتی فکر کی داغ بیل پڑتی ہے اور کبھی تخلیقی فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فکر کی نشو و نما سے ذہنی نشو و نما کا گہرا تعلق ہے۔ زبان فرد اور سماج کے درمیان فعال رشتہ پیدا کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے اور بحیثیت مجموعی شخصیت سازی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔"

یہ سچ ہے کہ عالمیت کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ میدان میں مقابلہ بڑھ گیا ہے اور اس مقابلے نے خوفناک قسم کی رقابت بھی پیدا کر دی ہے۔ لسانی شعبے میں بھی کچھ اس طرح کی رقابت پیدا ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے تازہ مثال کناڈا کی ہے۔ وہاں انگریزی اور فرانسیسی دو زبانیں ملکی سطح پر منظور شدہ ہیں لیکن فرانسیسیوں کا مطالبہ ہے کہ ایک ریاست جہاں ان کی اکثریت ہے اس کو کناڈا سے الگ کیا جائے اور یہ مطالبہ دن بدن زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ماہر سماجیات پروفیسر یوگیندر سنگھ نے عالم کاری کی وجہ سے زبانوں کے درمیان بڑھتی رقابت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"زبانوں کے درمیان مسابقت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ سماجی اور تہذیبی سطح پر ان کا فرق نمایاں ہو رہا ہے اور یہ عوامل اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کو مربوط کرنے کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ زبانیں سماجی حرکت پذیری اور اندرون سماج نئے ڈھانچے تعمیر کرنے کا ذریعہ بنتی جا رہی ہیں۔ کشاکش اور چیلنج کا یہ عمل کسی بھی سماج میں اس رجحان کو پروان چڑھاتا ہے کہ وہ سماج لسانی سطح پر اپنی

توانائی حاصل کرلے کہ نہ صرف شناخت بلکہ قانونی جواز کے اعتبار سے بھی اسے فوری اہمیت کا مسئلہ تصور کرلیا جائے۔''

اب سوال اٹھتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو زبان کے سامنے چیلنج کیا ہے؟ اور اس چیلنج سے مقابلہ کرنے کی طاقت اس زبان میں ہے کہ نہیں؟ آج دنیا میں جو روز نئی نئی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں ان تبدیلیوں کے درمیان اردو اپنی جگہ بنانے کے قابل ہے یا نہیں؟ آج تعلیم برائے تعلیم ایک از کار رفتہ تخیل ہے اور تعلیم برائے تہذیبی تشخص اور تعلیم برائے معاش کا تصور عام ہوگیا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تیز رفتاری ہر پانچ دس سال کے بعد حاصل شدہ علم کو بے معنی بنارہی ہے۔ ایسے حالات میں اردو زبان کا حشر کیا ہوگا؟ کیا اردو صرف اپنے علاقے تک محدود ہوکر رہ جائے گی یا اس کے دائرے اور وسیع ہوں گے؟

موجودہ دور میں وہی زبان اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے جو بازار کی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہو اور جس کا تعلق پیداوار اور مواصلات کے عمل سے ہو۔ جو معقولیت پسندی پر مبنی مہارت پیدا کرتی ہو اور جسے صرف اس زبان کے بولنے والوں کا ہی نہیں بلکہ مارکیٹ کا بھی سہارا ہو۔ چونکہ اردو اب صرف برصغیر تک محدود نہیں اور عالمی سطح پر اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اندر ایسی قوت پیدا کی جائے جس کی بدولت عالمی مارکیٹ پر اس کی پکڑ مستحکم ہوسکے۔

اردو زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرسکے کیوں کہ اس میں لچک ہے، حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت ہے۔ اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ بڑی خوبی سے اس میں کھپ جاتے ہیں اور ایسی شکل اختیار کرلیتے ہیں کہ اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ کسی بھی زبان کی بقا کا راز اس کے بولنے والوں کے حرکت وعمل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی زندگی کا ضامن اس زبان کی تعلیم ہے۔

لہٰذا اکیسویں صدی میں اردو زبان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کی تعلیم کو ایک تحریک کی صورت دی جائے اور ساتھ ساتھ اردو آبادی کو اس احساس کمتری کے خول سے باہر نکالا جائے کہ بغیر انگریزی کے ہماری دنیا سنور نہیں سکتی۔

یہ عہد کمپیوٹر کا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اس کا دخل نہ ہو۔ اس صورت حال میں اردو زبان کو کمپیوٹر سے منسلک کرنا وقت کی پکار ہے۔ اگر ہم اردو کو مکمل طور پر کمپیوٹر سے جوڑ دیتے ہیں اور کمپیوٹر کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تو عالمی گاؤں میں اردو کی شناخت مزید مستحکم ہوگی اور اس کو اپنانے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

آج ہم مادیت اور صارفیت کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم ہر چیز کو نفع ونقصان کی میزان پر پرکھتے ہیں اس لیے ہم اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ ہمارے بچے اردو میں تعلیم پاکر روزگار اور کاروبار کے میدان میں دوسرے شہریوں کے مقابلے میں پچھڑ جائیں گے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرکے اپنی صلاحیتوں کو بہتر طور پر سنوار سکتے ہیں۔

اردو زبان کے متعلق ایک غلط فہمی عام ہے کہ اردو صرف شاعری کی زبان ہے، ادب کی زبان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ہر قسم کے علوم وفنون سے متعلق معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ جدید تر اصطلاحات کی بھی کمی نہیں۔ جہاں تک اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے اور زندگی کے کسی شعبے میں کامیاب ہونے کا سوال ہے تو اس کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ دہلی کالج میں اردو کے ذریعے ہی مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کو اختیار کیا گیا تھا اور ان دونوں جگہوں سے تعلیم حاصل کرنے والوں نے اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

اردو زبان میں وہ علمی اور فکری سرمایہ موجود ہے جس کی مدد سے ہم اس چکاچوند دنیا میں جی سکتے ہیں اور ان طاقتوں کو اپنی گرفت میں لا سکتے ہیں جن کے ذریعے ہم اپنی موجودہ پسماندگی کا ازالہ کرسکیں۔ آج اردو کمپیوٹر کی زبان بن چکی ہے۔ اس میں سائنس، تاریخ، نفسیات، سیاسیات، معاشیات تمام علمی شعبوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے تک اردو آبادی کے 90فیصد طالب علم اردو نہ صرف مادری زبان کے طور پر پڑھتے تھے بلکہ دیگر مضامین مثلاً سائنس، حساب، فلسفہ، تاریخ اور سوشل سائنس بھی اردو زبان میں پڑھتے تھے لیکن آج حالت اس کے برعکس ہے۔ دیگر اسکولوں کی بات تو دور رہی اقلیتی اسکولوں میں بھی مشکل سے پانچ فیصد طالب علم ایسے ملیں گے جو غیر لسانی مضامین اردو میں پڑھتے ہوں۔ ضرورت اردو آبادی کے بچوں کو دوبارہ اردو ذریعۂ تعلیم سے جوڑنے کی ہے۔ اگر اردو آبادی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتی ہے تو پرائمری اور ہائی اسکول سطح سے اردو ختم ہوجائے گی۔ پھر ہم زیادہ دنوں تک یونیورسٹیوں میں بھی اردو کا چراغ روشن نہیں رکھ سکیں گے اس لیے اردو آبادی کو انگلش میڈیم اسکولوں کی ظاہری چمک دمک سے باہر نکلنا چاہیے اور نئی نسل جو اردو سے بیگانہ ہوتی جارہی ہے، اس کو اردو زبان کی تعلیم سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے ورنہ غالب کے اشعار کتھک رقاصہ محترمہ اوما شرما کے رقص میں تو دکھائی دیں گے مگر ہمارے بچے کہیں گے کہ کوئی بتلاؤ کہ غالب کون ہے؟ □□□

پتہ:
Deptt. of Urdu,
Millat College,Darbhanga-846004

دیوبرتا بسو

آن لائن تعلیم — مسائل اور امکانات

تعلیم کسی قوم کی تقدیر بنانے اور سنوارنے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ یہ انسانی وسائل کی ترقی میں معاون ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کی اقتصادی حالت میں بھی بہتری لاتی ہے۔ کمرۂ جماعت (Class Room) پر مبنی تعلیم کا روایتی ڈھانچہ صدیوں پہلے معرض وجود میں آیا اور اس نے بہت سارے ادوار سے گذر کر ترقی اور توقیر کی منزلیں طے کیں۔ تاہم گذشتہ دس برسوں میں تعلیم فراہم کرنے کے طور طریقوں میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے طفیل ڈرامائی انداز میں تبدیلی آئی ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کو جو کہ رسمی تعلیم کا متبادل ہے، زیادہ سے زیادہ پرکشش اور جاذب توجہ بنانے کے لیے ٹیلی مواصلات کے مضبوط اور موثر وسائل اختیار کیے گئے ہیں ای میل، ٹیلی کانفرنسنگ، ہیش متی (Hypertext) اور کمرۂ جماعت میں عملی طور پر کام کرنے کے طریقۂ کار نے فاصلاتی نظام تعلیم اور اس کے معیار کو اور بھی بہتر بنادیا ہے۔ روایتی طور پر تعلیم کی بنیاد ایک ایسے نظام پر تھی جس کا مرکز و محور ایک معلم کو سلسلہ وار مضامین پڑھانا اور عملی مشق کرانا تھا۔ حال ہی میں محققین نے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ماہرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور تفہیم و توضیح کے امکانات کو روشن کرنے کے لیے باہم کاری (Collaboration) کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ ''کمپیوٹر اور اس کے متعلقات کو جدید طریقوں سے استعمال میں لاکر انسانی باہم کاری میں سہولیت پیدا کی جاسکتی ہے۔''

اکتسابی نظام کی تشکیل و تعمیر میں بیک وقت متعدد سماجی عناصر فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ عالمی سطح پر تعمیر نو کے تصور نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر روزگار کی تحصیل کو ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بنادیا ہے اور اسی لیے ہر سماجی اور تعلیمی کارکن کی از سر نو تربیت ایک لازمی امر بن گیا ہے۔ روایتی تعلیمی اداروں کو جو مزید تربیت دینے کے لیے اہم وسیلے تصور کیے جاتے ہیں، جو وسائل میسر ہیں ان کو تعمیر نو کے تصور نے ڈرامائی حد تک کم کردیا ہے۔ نتیجے کے طور پر حکومتیں، صنعتیں اور طلبہ اس نظام تعلیم پر اصرار کرنے لگے جو لاگت اور وقت دونوں لحاظ سے نفع بخش اور نجو وقتی ہو۔ اس تناظر میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت اوپن لرننگ (Open Learning) کا طریقہ وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ عام مشاہدے کے مطابق تیسری دنیا کے کئی ممالک میں فارغ التحصیل طلبہ اور کالجوں / یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد میں حیرت ناک حد تک عدم توازن پایا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر روزگار کے بڑھتے ہوئے مواقع کے رجحان کو نظر میں رکھ کر ترقی پذیر ممالک کے لیے مخصوص اور متنوع معیاری تعلیم ناگزیر بن گئی ہے تاہم عالمی تجارتی تنظیم (World Trade Organization) کے اصول وضوابط کی رو سے جو معیاری تعلیم فراہم کی جاری ہے وہ ایک تجارتی مسئلہ بن گئی ہے۔ اس تناظر میں آن لائن نظام تعلیم مستقبل قریب میں ایک امید افزا عمل ہوگا۔

آن لائن تعلیم کے فوائد: آن لائن سے ہر مقام اور ہر شخص تک تعلیم پہنچتی ہے: ورلڈ وائڈ ویب تعلیمی اداروں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ وسیع علاقے پر محیط اپنے طبقۂ طلبہ کو تربیت اور اہم معلومات فراہم کرسکے اس عمل میں طلبہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد و بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ کہیں بھی انٹرنیٹ کے ذریعے اس تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں خواہ گھر میں ہوں یا دفتر میں یا کمرۂ جماعت میں۔

آن لائن تعلیم طلبہ کو یہ آسانی فراہم کرتی ہے۔ کہ وہ کسی بھی وقت اپنی سہولت سے پروگرام کے مواد سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ کمرۂ جماعت کی چار دیواری میں قید کرکے طلبہ کو تعلیم دینے کا تصور بہت ہی روایتی ہے۔ طلبہ آن لائن نظام تعلیم کے تحت کہیں بھی اور کسی بھی وقت اچھی تربیت حاصل کرسکتے ہیں۔

آن لائن تعلیم کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ سستی اور کفایتی ہے۔ اس طریقہ تعلیم سے وقت اور پیسہ دونوں کی بچت کی جاسکتی ہے دوسرے اداروں کے تعلیمی مواد پر نظر ثانی کے لیے جتنا خرچ کیا جاتا ہے اس کے صرف ایک حصے سے آن لائن تعلیمی مواد پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے۔ اس طرح اس کے فائدے بہت ہی دوررس ہیں۔

طالب علم پر توجہ: آن لائن نظام تعلیم میں طالب علم مرکوز و محور ہے۔ ٹیکنالوجی ایک عام انسان کے مزاج، معیار، طریقۂ اکتساب اور مہارت کو ملحوظ خاطر رکھ کر مواد فراہم کرتی ہے۔

عالمی سطح پر تحقیق کرنے پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ روایتی طریقہ تعلیم کے مقابلے میں آن لائن نظام تعلیم کے بہترین نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک ماہر کی خدمات روایتی کلاس روم کے مقابلے میں آن لائن نظام تعلیم میں اچھے طریقے سے حاصل کی جاسکتی ہیں اگر کسی پروگرام میں ماہر کی ضرورت پڑتی ہے تو اس مخصوص ماہر کی ہدایات اور مشورے بیک وقت کئی طالب علموں کو بھیجنے سے وقت اور پیسہ دونوں بچ جاتے ہیں۔

روایتی کمرۂ جماعت (Class Room) کے مقابلے میں اس نظام میں طلبہ کو وقت کے تئیں حساس رہنے کی تربیت احسن طریقے پر دی جاسکتی ہے۔

آن لائن نظامِ تعلیم کے خواہشمند:

آن لائن تعلیم کے خواہش مند مندرجہ ذیل ہیں:

جو روزگار کے مواقع کو بہتر بنانے یا اپنے پیشے میں آگے بڑھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، جو اپنا پیشہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں لیکن کل وقتی کورس میں داخلہ لینے کے لیے بروقت فیس ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، جو کل وقتی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں، جو جمالیاتی تسکین حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں اس ضمن میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے لوگ شامل ہیں، جو جغرافیائی حالات اور بالخصوص تعلیمی ادارے دور ہونے کی وجہ سے کل وقتی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ہیں، جو لوگ جسمانی معذوریوں کی وجہ سے کلاس روم میں حاضر نہیں ہو پاتے ہیں۔

آن لائن تعلیم کے خواہشمند درج ذیل بھی ہو سکتے ہیں:

دیہی اور شہر کی جھگی جھونپڑیوں کی گھریلو خواتین، بزرگ شہری، رسمی تعلیم کو ترک کرنے والے، جو طلبہ کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے اہل نہیں ہوتے ہیں، تعلیمِ بالغان کے فارغین۔

آن لائن نظامِ تعلیم کے نقصانات:

میکلین (Mclean) نے ترقی پذیر ممالک کے تناظر میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کے حوالے سے آن لائن تعلیم کے درج ذیل نقصانات بتائے ہیں:

اساتذہ، کتب خانوں اور دوسرے وسائل کی عدم موجودگی کے باعث فاصلاتی تعلیم میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، گھریلو انتشار اور کام کے دباؤ کی وجہ سے حصولِ تعلیم مشکل ہو جاتا ہے، ترقی پذیر ممالک میں آن لائن تعلیم فراہم کرنے کی راہ میں انتظامی مسائل، مالی دشواریاں اور انسانی وسائل کی نایابی جیسی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں، آن لائن تعلیم بھی انھی صاحبِ ثروت افراد کو تعلیم فراہم کرتی ہے جو رسمی یا روایتی تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ آن لائن تعلیم نہایت ہی کم قیمت پر فراہم کی جاتی رہے، جب اس کا دائرہ بڑھ جاتا ہے تو اس تک عام لوگوں کی رسائی بھی بڑھ جاتی ہے جس کا فی الفور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم فراہم کرنے کے ذرائع کمزور ہو جاتے ہیں اور آخر کار تعلیم کا معیار خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب سے شمالی ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کا تصور سامنے آیا ہے، آن لائن تعلیم کو تہذیبی سامراجیت تصور کیا جاتا ہے۔ عطیات پر چلنے والے آن لائن تعلیمی پروجیکٹ زیادہ وقت تک قائم نہیں رہ سکتے۔ غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں کورس کی زبان اور تہذیب کی تفہیم و توضیح میں دشواری پیش آتی ہے۔

انٹرنیٹ کو کیسے ایک عام آدمی کے لیے قابلِ رسائی بنایا جا سکتا ہے؟

آن لائن تعلیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے عام انسان تک انٹرنیٹ کی رسائی یقیناً ایک لازمی شرط ہے۔ ہمہ گیر سطح پر نہ سہی، پھر بھی ضروری مقامات پر انٹرنیٹ سے سب کو استفادہ حاصل ہو تب کہیں جا کر کسی طرح یہ عمل موثر بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ذیل میں کچھ حکمت عملیاں پیش کی جا رہی ہیں:

(i) مقامی اور قومی سطح پر انفارمیشن شیئرنگ گروہوں کی تشکیل، (ii) تبادلۂ معلومات کے لیے اصول وضع کرنا، (iii) ترقیاتی معاملوں میں سستا سافٹ ویر تیار کرنا، (iv) عام انسان کو انٹرنیٹ اور ای میل کی تربیت فراہم کرنے کے لیے کتابیں تیار کرنا، (v) غیر سرکاری تنظیموں سے مدد لینا اور مذکورہ میدانوں میں کام کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنا، (vi) ضرورت مند عوام اور نیم خواندہ لوگوں کی تعداد معلوم کرنے کے لیے Info-mediaries کی تشکیل کرنا، (vii) Info-Banks کو معرضِ وجود میں لانا، (viii) مفید اور ضرورت پر مبنی ویب سائٹ کی تشکیل، (ix) بحیثیت Info-mediaries کام کرنے کے لیے رضاکاروں کا اندراج کرنا، (x) کسی مخصوص علاقے کے غیر مقیم ہندوستانیوں (NRI's) سے مدد لے کر بنیادی ڈھانچہ ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی ضروریات کو پورا کرنا، (xi) کثیر الاداراتی شراکت داری، (xii) مہاراشٹر کے وارانہ "Wired Village" کو ماڈل بنا کر کام کرنا۔

ہندوستانی ادارے جو فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت زراعت اور دیہی ترقی کے شعبوں میں متعلقہ کورس کراتے ہیں ذیل میں درج ہیں:

برلا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اینڈ سائنس، کرسچن میڈیکل کالج، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف فینانس، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، یونیورسٹی آف حیدرآباد، تامل ناڈو ایگریکلچرل یونیورسٹی، یونیورسٹی آف میسور، یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی۔

نتائج: روز بہ روز سائنسی ایجادات انکشافات اور ذرائع ابلاغ کی ترقی سے اوپن اور فاصلاتی نظامِ تعلیم کے حوالے سے غیر معمولی نئے اور جاذبِ توجہ طریقے سامنے آ رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر فاصلاتی تعلیم کو اب غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس نظامِ تعلیم سے متعلق جدید طریقے جاذبِ توجہ ہیں تاہم ان کو کام میں لانے میں جو مشکلات اس وقت ہمارے سامنے ہیں وہ ٹیکنالوجی کے بجائے انسانی وسائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ کورسیز صرف اور صرف اس صورت میں کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ خواہشمند طلبہ کی ضروریات کو ہر سطح پر پورا کریں۔ ٹیکنالوجی کے علاوہ موزوں اور مناسب نصاب کے ساتھ بہترین مواد پیش کرنے میں ہی فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کامیابی اور اثر کا راز مضمر ہے۔

□□□

مترجم: الطاف انجم
Deptt. of Urdu,
Maulana Azad University,
Hyderabad-500032

افتخار نسیم

(نظم)

خزاں کے پہلے دن کی شام کی اداسی

اب کے برس خزاں کچھ ایسے ٹوٹ کے آئی
کہ پتے
پیلے ہونے سے پہلے ہی گر گئے
برہنہ درخت ایسے شرمندہ
زمین پر نظریں گاڑے کھڑے ہیں
جیسے ہارنے والی قوم کی
ننگی عورتیں
اپنے فاتح کے سامنے کھڑی ہوں
درختوں کی برہنگی چھپانے کے لیے
برف بھی نہیں گری
ہجرت کرنے والے پرندے
قطاریں بنا کر ہمارے سروں پر سے گزر رہے ہیں
بچپن میں ریڈیو کا ڈائل گھماتے ہوئے
کبھی کبھی شارٹ ویو پر
نادیدہ لوگوں کی گفتگو سن کر
میں کتنا خوش ہوتا تھا
اب تو لگتا ہے ساری دنیا دیکھ لی ہے
کوئی بھی اجنبی نہیں رہا
سب باتیں ایک سی ہیں
کسی میں کوئی اسرار نہیں ہے
میں کس ٹوائیلائٹ زون میں ہوں
کہ سب کچھ ہو رہا ہے
اور کچھ نہیں ہوتا
کیا عمر اس تجارت کا نام ہے
جہاں سینت سینت کر رکھی ہوئی خوشیاں
اور یادیں
گزرے وقت کے سکوں کی طرح
بے قیمت ہو جاتی ہیں
اور ہم اس رقاص کی طرح ہو جاتے ہیں
جسے سارے رس نہرت بھاؤ اور توڑے آتے ہیں
لیکن سٹیمنا نہیں رہتا
بدن کے آتش دان میں اب صرف
ہڈیاں سلگ رہی ہیں
اس سے چمنیوں پر پڑی ہوئی برف
نہیں پگھلنے والی
آؤ خزاں کے پہلے دن ان لوگوں کو یاد کریں
جن کے نام اور شکلیں بھی یاد نہیں

●

(بہ شکریہ ــــ ماہ نامہ "پرواز" لندن، جنوری 2008)

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل، ماہ نامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی "فکر و تحقیق" سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

شرجیل احمد خاں

فن اور اخلاقیات ـــــ ارسطو کی نظر میں

یہ سوال کہ فن کا مقصد کیا ہے، (خاص کر شاعری کے تعلق سے) ایک زمانے تک یونان میں بحث کا موضوع بنا رہا ہے۔ اس ضمن میں دو طرح کے خیالات رائج تھے۔ روایتی خیال (جس کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی) تھا کہ شاعری کا اخلاقیات سے بلاواسطہ تعلق ہے۔ شاعر کا اصل تفاعل ایک مدرس کا ہے۔ یہ لوگ ہومر (Homer) کو ایک شاعر کی حیثیت نہیں بلکہ ایک مصلح کی حیثیت دیتے تھے۔ ان کے خیال میں ہومر نے نیک زندگی گزارنے کے اہم اصول بتائے ہیں، جن میں فلسفے کے تمام اہم نکات مضمر ہیں۔

دوسرے مکتب فکر کا موید ارسطو تھا۔ اس کے خیال میں شاعری جذباتی آسودگی کا وسیلہ ہے اور شاعری کا اصل تفاعل خوشی و مسرت بہم پہنچانا ہے۔ وہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ شاعری کتب سازی کی طرح نابالغوں کے لیے حد درجہ ضرررساں ہے، لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ شاعری کا اصل مقصد ناپختہ ذہنوں کی تربیت اور اصلاح نہیں ہے۔ شاعری کا مقصد اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ارسطو نے اپنی تصنیف (Poetics) میں شاعری کو جس طور پر برتا ہے وہ اس کے انداز تنقید سے میل نہیں کھاتا۔ اپنی تصنیف "Poetics" میں اس نے شاعر کو ایک سیاست داں اور مصلح کی نظر سے دیکھا ہے۔

شاعری کے متعلق افلاطون کے خیالات زیادہ سخت گیر نہ تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہی شعرا اس کی مثالی ریاست (Republic) میں شہریت کے مستحق ہیں جو اخلاقیات اور سیاست کا درس دیتے ہیں۔ افلاطون، شاعری میں بھجن، حمد اور بڑے لوگوں کی قصیدہ خوانی کو روا رکھتا تھا۔ دیگر اقسام شاعری اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ ارسطو، افلاطون کے ان خیالات کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ ارسطو تعلیمی افادیت اور جمالیاتی تسکین میں تفریق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شاعر ناصح یا مصلح نہیں ہے۔ شاعری کا کام تمام فنون لطیفہ کی طرح جذباتی آسودگی، انبساط اور مسرت بہم پہنچانا ہے۔ وہ شاعری کو سیاست سے منسلک نہیں کرتا۔ شاعری کی ابتدا، اس کا فروغ، کن اجزا سے شعری ساخت کی تشکیل ہوتی ہے، ذہن پر شاعری سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان باتوں پر ارسطو نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے شعری بناوٹ (Composition) کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ان اجزا کی ماہیت کیا ہے اور کس طرح وہ ذہن کو ایک مخصوص انداز میں متاثر کرتے ہیں، وہ شاعری کے ناصحانہ پہلوؤں کو رد کرتا ہے۔ وہ ان باتوں کا ذکر نہیں کرتا کہ کس طرح مختلف اصناف شاعری، سامعین یا قارئین کی اخلاقی حس کو بیدار کرتی ہیں۔ وہ زور دے کر کہتا ہے کہ جو پیمانہ شاعری کی سچائی کی تصدیق کرتا ہے۔ ہم اس پیمانے سے سیاست کی سچائی کی تصدیق نہیں کرسکتے۔ دونوں جدا جدا ہیں۔ شاعری کی بنیاد امر واقعہ پر قائم نہیں ہوتی۔ شاعری امر واقعہ کی صداقت میں قلب ماہیت ہے۔ ارسطو بار بار اصرار کرتا ہے کہ "شعری سچائی"، "تجرباتی سچائی" کے مماثل نہیں ہوتی۔ دونوں میں فرق ہے۔ شاعری علم طب، سائنس یا تاریخ کا بحر میں بیان نہیں کیا ہے، شاعری کے اپنے ضابطے، اپنے معیار، اپنے اصول ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے علوم مثلاً طب، سیاست، تاریخ کے معیار سے جانچے نہیں جاسکتے۔ اخلاقیات اور شاعری کے اپنے اپنے اصول میں ارسطو کے زمانے میں یہ خیال رائج تھا کہ ہومر (Homar) ہر فن، ہر ہنر کا ماہر تھا۔ وہ ایک بڑا ناصح اور مصلح تھا۔ وہ لوگوں کا راہبر تھا۔ اس کی نصیحتیں لوگوں کی نجات دہندہ تھیں، ارسطو ان سب باتوں کو نہیں مانتا۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ ہومر علم طب اور دوسرے فنون (جو اتفاقاً اس کی شاعری کے موضوع بن گئے تھے) کا ماہر تھا۔ اس کے باوجود وہ سوال اٹھاتا ہے کہ جنگیں، سیاست، تعلیم جو ہومر کی شاعری کے خاص موضوعات تھے اور جن کے ضمن میں ہومر نے اہم اصولوں کی نشان دہی کی تھی، کیا ان اصولوں پر حکومتیں کامیابی کے ساتھ چلائی جاسکتی ہیں؟ افلاطون کے زمانے میں کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ دیوتاؤں کے قصے، ان کی آپس کی جنگیں، قتل و غارت گری اور مکاری و عیاری کے قصے لوگوں کے اخلاق کے لیے ضرررساں تھے۔ وہ سب جھوٹے قصے تھے اور مخرب اخلاق تھے۔

ارسطو ان قصوں کی سچائی پر یقین تو نہیں رکھتا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ لوگوں میں رائج یہ قصے روایت بن گئے ہیں، اس لیے وہ شاعری کے موضوع بن سکتے ہیں۔ اسی طرح افلاطون طنز یا ہجو (Satire) کی بھی ملامت کرتا ہے۔ ارسطو اس ضمن میں افلاطون کی رائے سے اتفاق رکھتا تھا۔ وہ ہجو کو ایک اسفل اور پست صنف قرار دیتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہجو کردار کی تضحیک کا باعث بنتی ہے بلکہ اس لیے کہ فن کی اساس جمالیات ہے۔ شاعری ہماری جمالیاتی حس کی تسکین کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ ارسطو کے خیال میں جو اساطیری قصے عوام میں رائج ہیں گو وہ بادی نظر میں مخرب اخلاق معلوم ہوں، لیکن چونکہ وہ ہماری روایت میں داخل ہوگئے ہیں، اس لیے وہ فن اور شاعری کے موضوع بن سکتے ہیں۔ ارسطو اپنی تصنیف "شعریات" میں Euripedes کا کوئی بیس بار ذکر کرتا ہے اور بہت سی جگہوں میں وہ اس کا سختی سے احتساب کرتا ہے۔ وہ

Euripedes کے ڈراموں کی فنی خامیوں، ساخت کی کمیوں اور کردار نگاری کی غلطیوں کی سخت تنقید کرتا ہے لیکن اس احتسابی عمل میں وہ اخلاقیات کا سوال نہیں اٹھاتا۔ وہ Sopocles کی تعریف ڈراموں کی ساخت اور فن کی خوبیوں کی وجہ سے کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ ارسطو کسی نظم کے اخلاقی پہلوؤں یا مصنف کے اخلاقی کردار سے صرف نظر کرتا ہے، بلکہ ارسطو کی نظر میں فن پارے میں ان اجزا کی موجودگی ضروری ہے۔ اس سے فن پارے میں اثرانگیزی پیدا ہوجاتی ہے۔ ارسطو کے خیال میں ادب کا جوہر خود زندگی ہے اور المیہ Tragedy اپنے مخصوص معنوں میں زندگی کی نمائندہ ہے، جس میں انسانی خوش حالی اور انسانی دکھ، درد دونوں کی شمولیت ہے۔ یہ ایک عظیم اور سنجیدہ عمل ہے جس میں کردار خود اپنا خارجی اظہار پالیتا ہے۔ زندگی کا ہر جز دراصل کل کی تعبیر ہے۔ ارسطو کا نظریہ تھا کہ اخلاق زندگی کی پشت میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس کا مفروضہ تھا کہ خوشی اور مسرت دراصل اخلاقیات کی اساس ہیں، لیکن فن کا معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ ناصحانہ اور مصلحانہ شاعری کو فن کا درجہ نہیں دیتا اور وہ شعری تخلیقات کی خوبیوں کو اخلاقیات کی روشنی میں پرکھنا جائز نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک شاعر کا اصل مقصد جمالیاتی تسکین بہم پہنچانا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جمالیاتی تسکین کسی مثالی نمائندگی سے حاصل ہو اور اپنی ماہیت میں مکمل اور بے لوث ہو۔ ارسطو کے خیال میں اس طرح کی بے لوث مسرت ایسی شاعری سے حاصل نہیں کی جاسکتی جو اوچھے اور پست خیالات کی نمائندگی کرتی ہو اور جو انسانی مقدر کی غلط اور گمراہ کن نمائندگی کرتی ہو۔

ان مباحث کو سمیٹتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ ارسطو پہلا مفکر تھا جس نے جمالیات کو اخلاقیات سے الگ کیا۔ وہ برابر اپنے موقف پر قائم رہا کہ شاعری کا اصل مقصد احساس جمال جگانا ہے۔ شاعر اگر احساس جمال جگانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے تو گویا وہ شاعری کے تفاعل سے انحراف کرتا ہے۔ وہ اس صورت میں ایک مدرس کی حیثیت سے تو صائب ہوسکتا ہے، لیکن شاعری کی حیثیت سے ناکام رہتا ہے۔

□□□

3, Bhikanpur, Bhagalpur-812001

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعودالحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

اقبال محی الدین

علی گڑھ کی نمائش اور مشاعرہ

علی گڑھ کی سالانہ صنعتی اور زرعی نمائش ہر سال جنوری/فروری کے مہینے میں آتی ہے اور یہاں کے ریگستانی ماحول میں رنگ ونور کی بارش کردیتی ہے۔ گو کہ علی گڑھ کا شمار اب ترقی یافتہ شہروں میں ہونے لگا ہے مگر شہر اور سول لائن کے بازاروں میں اب بھی وہ گہما گہمی نہیں ہوتی جیسی دہلی یا لکھنؤ میں ہوتی ہے۔ یہاں بجلی بھی کم ہی رہتی ہے۔ لہٰذا اندھیری اور سنسان سڑکیں اور بازار اپنی دلکشی قائم نہیں رکھ پاتے۔ بس لے دے کے یہ ایک نمائش ہے جو ہر سال تقریباً ایک ماہ کے لیے آتی ہے جس سے سارا ماحول بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ علی گڑھ کا نمائش میدان ایک دلہن کی طرح سج کر جگمگانے لگتا ہے۔ ہزاروں لوگ وہاں روزانہ جاتے ہیں اور بچوں کی طرح روشنی کی رنگ برنگی لڑیوں کو دیکھ کر خوش ہولیتے ہیں۔ دہلی یا لکھنؤ کا تو ہر محلہ اور بازار ایک نمائش گاہ کی طرح ہے مگر علی گڑھ کی اس سالانہ نمائش کے لیے لوگ سال بھر تک انتظار کرتے ہیں۔ دن میں یہ ایک دیہاتی میلے کی طرح لگتی ہے اور شام ہوتے ہوتے بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھتی ہے۔ یونیورسٹی، سول لائن اور شہر کے لوگ بن سنور کر نمائش دیکھنے جاتے ہیں۔ اس نمائش کی اہمیت یہ ہے کہ سال کا یہ آخری رنگین فنکشن ہوتا ہے۔ اس کے بعد طلبہ اپنے اپنے امتحانوں کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر طالب علم نمائش گھومنے تقریباً روزانہ ہی جاتا ہے۔

علی گڑھ کی نمائش کی خاص چیزیں ہیں گرما گرم کباب۔ پراٹھے کا سائز ایک کار کے ٹائر کے برابر ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے ہر ہال کی طرف سے طلبہ کی کباب، پراٹھے اور حلوے کی دعوت ہوتی ہے۔ نمائش میں پراٹھے، کباب، حلوے اور دیگر کھانے کی چیزوں کے کئی چھوٹے بڑے ہوٹل عارضی طور سے لگائے جاتے ہیں جن میں جھنڈا ہوٹل اور صابری ہوٹل مشہور ہیں جہاں روزانہ باری باری سے ہر ہال کے لڑکوں کی یونیورسٹی کی طرف سے دعوت ہوتی رہتی ہے، لڑکیوں کی بھی دعوت ان کے ہال کی طرف سے ان ہوٹلوں میں ہوتی رہتی ہے۔ مگر دعوت کی تاریخ راز میں رکھی جاتی ہے۔ پھر بھی لڑکے کسی نہ کسی طرح تاریخ معلوم کر ہی لیتے ہیں اور اس روز نمائش ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ اس روز وہاں بھیڑ بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیا رونق ہوتی ہے۔ ہر لڑکا بنا سنورا، ہیرو بنا وہاں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ لڑکیاں بھی اپنے بہترین لباس اور میک اپ میں چہل قدمی کرتی نظر آتی ہیں۔ رنگ برنگی روشنی کی لڑیوں میں یہ شہزادیاں پریوں کی طرح اٹھلاتی، شاپنگ کرتی یا کچھ کھاتی پیتی نظر آتی ہیں۔

نمائش میں داخل ہونے کے لیے کئی گیٹ بنے ہوئے ہیں جن کے الگ الگ نام ہیں۔ جیسے مثل گیٹ، مزمل گیٹ، جلالی گیٹ اور دربار گیٹ وغیرہ۔ ان دروازوں کو روشنی کی لڑیوں سے خوب سجایا جاتا ہے۔ نمائش میں کئی ونگ (Wings) ہیں۔ کسی میں جھولے اور سرکس، کسی میں کباب پراٹھے، کسی میں چوڑیاں، کسی میں بریلی کا سرمہ، کھلونوں کی دکانیں، کسی میں چاٹ کی دکانیں، کسی میں بدایوں کے پیڑے، شلجم کے اچار، کپڑے، کمبل، ٹن کے چھوٹے بڑے بکس، آئس کریم، کافی، چورن، کھیل کا سامان اور بجلی کا سامان سجا ہوتا ہے۔

جیسے ہی ہم نمائش کے پہلے گیٹ میں داخل ہوتے ہیں ہماری داہنی طرف دیہی اور زرعی چیزوں کی دکانیں نظر آتی ہیں اور بائیں طرف کی ونگ میں صنعتی سامان۔ زرعی سامان کی دکانیں عمدہ قسم کے اناج، پھل اور پھولوں کے بیجوں اور کیمیائی کھاد یوریا سے پُر نظر آتی ہیں۔ نمائش گاہ کے اس حصے کو طرح طرح کے موسمی پھولوں اور گھاس سے سجایا جاتا ہے۔ خوبصورت پھولوں کے گملے قدم قدم پر قطار در قطار نظر آتے ہیں جو نمائش کی آرائش میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہاں زمین پر موسمی سبزیوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے جو لوگوں کو اپنی طرف ملتفت کرتی رہتی ہے۔ کھادی بھنڈار، شہد اور دیگر دیہی اشیا کی نمائش اس حصے میں کی جاتی ہے۔

بائیں طرف کی ونگ میں صنعتی نمائش لگتی ہے جس میں طرح طرح کی مشینیں، موٹر سائیکل، سائیکل، بچوں کے کھلونے، بجلی کا سامان، ٹریکٹر، بینت کا فرنیچر، پھلوں کے جوس کی دکانیں، جو سر مکسچر اور صنعت کو فروغ دینے کی مشینیں، آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل مشینیں، آٹا پیسنے کی پتھر کی بال بیرنگ والی ہاتھ کی چکی اور نل وغیرہ کی نمائش کی جاتی ہے۔ موجودہ دور کی سائنسی اور صنعتی ترقیات کا بہترین مظاہرہ اس ونگ میں ہوتا ہے۔

زرعی و صنعتی ونگ کے درمیان کا راستہ بہت کشادہ ہے جس پر لال رنگ کی بجری بچھائی جاتی ہے تاکہ اگر وہاں پانی گرے تو پھسلن نہ ہو اور سڑک بھی خوبصورت لگے۔ آگے بڑھیے تو دونوں طرف خیمے ہی خیمے نظر آتے ہیں۔ کسی میں پراکٹر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کیمپ ہے تو کسی میں پولیس کی چوکی، کسی میں پیکٹ والا ٹھنڈا دودھ، مٹھا اور جوس ملتا ہے تو کسی کیمپ میں چائے اور کافی کا انتظام ہے۔ ہر کیمپ بہت خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے جہاں بیٹھ کر آپ لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو نمائش کا مین گیٹ آجاتا ہے جو روشنی کی سجاوٹ سے بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اس گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے پھر

ہمیں دو ونگ نظر آتی ہیں۔ داہنی طرف کمبل، دریاں، چادریں، کھادی کا سامان اور ٹن کے چھوٹے بڑے بکسوں کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ سڑک کے کنارے کنارے ٹھیلے والے اپنی اپنی دکانیں لگائے نظر آتے ہیں جہاں پوپ کارن، چاٹ، موزے، بچوں کے کپڑے، غبارے وغیرہ کثرت سے نظر آتے ہیں۔ کراکری کی دکانیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ نان ختائی کی دکانیں بھی ہوتی ہیں جہاں لوگ گرما گرم نان ختائی خریدتے اور کھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ بائیں طرف کی ونگ میں بھی بہت خوبصورتی سے دکانیں لگی ہوتی ہیں جہاں بچوں کے کھلونے، آئس کریم، جوس اور کپڑے ملتے ہیں۔ یہی سڑک آگے بڑھ کر سرکس اور جھولوں کی طرف جاتی ہے۔ بیحد بھیڑ ہوتی ہے اس سڑک پر۔ چھوٹے موٹے گھریلو سامان بھی یہاں افراط سے ملتے ہیں۔

اب ہم مین گیٹ (Main Gate) سے نمائش کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ نہایت خوبصورت اور سجی ہوئی دکانیں سڑک کی دونوں طرف قطاریں لگی نظر آتی ہیں۔ سامنے بارہ دری ہے، بدایوں کے پیڑے اور بچوں کے گرم کپڑوں اور ٹوپیوں کی دکانیں اسی طرف ہیں۔ ان کے علاوہ بارہ دری کی دوسری طرف چوڑیوں اور بریلی کے سرمے کی سجی سجائی خوبصورت دکانیں نظر آتی ہیں۔ آخر میں چاٹ والوں کی دکانیں ہیں جہاں کافی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

نمائش کے خاص حصے میں سڑک کی دونوں طرف چورن کی دکانیں، کشمیری شال اور گرم کپڑوں اور چادروں کی دکانیں بیحد جاذب نظر ہیں۔ بجلی کے سامان، فرنیچر وغیرہ کی نمائش بھی اسی ونگ میں ہوتی ہے۔ آخر میں دربار گیٹ آتا ہے جس کے اندر داخل ہونے پر بڑے بڑے شامیانے اور اسٹیج بنے نظر آرہے ہیں جہاں کلچرل پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان میں کبھی مشاعرہ، کبھی کوی سمیلن، کبھی رقص و موسیقی کی محفلیں اور کبھی قوالی کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

علی گڑھ کی نمائش کے اندر ایک مشہور جگہ ہے جسے بارہ دری کہتے ہیں۔ سنگِ مرمر سے بنی ہوئی یہ بارہ دری بہت خوبصورت لگتی ہے۔ یہ جگہ نمائش کے عین مرکز پر واقع ہے جہاں لڑکے لڑکیاں اور لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں، عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ بارہ دری پر لگے لاؤڈ اسپیکر پر بار بار اعلان ہوتا رہتا ہے کہ فلاں صاحب، فلاں صاحب یا صاحبہ کا بارہ دری پر انتظار کر رہے ہیں، وہ وہیں پہنچ جائیں۔ اس طرح ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے لوگ بارہ دری پر مل جاتے ہیں۔ نمائش گراؤنڈ پر اس طرح بارہ دری کی بہت اہمیت ہے کیونکہ وہ بچھڑے ہوؤں کو ملانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

علی گڑھ کا ذکر ہو تو مختار صاحب بے اختیار یاد آجاتے ہیں۔ مختار صاحب جغرافیہ ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر تھے۔ ان کو کون نہیں جانتا؟ اگر وقتی طور سے بھول بھی گیا ہو تو ''مختار گھوڑا'' کہنے پر ہر طالب علم کو یاد آجائیں گے۔ لمبا قد، چوڑا سینہ، نہایت رعب دار چہرہ، شیروانی پاجامہ اور لال ترکی ٹوپی پہنے ہوئے۔ سینئر سے سینئر لڑکے کی ہوا ان کو دیکھ کر خراب ہوتی تھی۔ عرصے تک یونیورسٹی میں ڈپٹی پراکٹر رہے اور نہایت رعب سے، نڈر ہو کر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

علی گڑھ کی صنعتی نمائش کے زمانے میں خاص کر 9 بجے رات کے بعد بارہ دری پر دور سے ان کی لال ترکی ٹوپی دیکھ کر لڑکے ادھر ادھر چھپنے لگتے تھے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں 9 بجے رات کے بعد یونیورسٹی کے لڑکوں کو نمائش میں رکنے کی اجازت نہیں تھی اور اس پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ لڑکے طرح طرح کے فارمولے لگا کر نمائش میں دیر تک رکنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی کہتا کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں، کوئی کہتا کہ میرے مہمان آئے ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کچھ لڑکے تو کبھی کبھی بھیس بدل کر بھی نمائش میں دیر تک رکنے کی غرض سے آتے تھے۔

ایک روز کسی پراکٹوریل مانیٹر نے 10 بجے رات میں مختار صاحب کو بتایا کہ ایک لڑکا برقعہ پہن کر نمائش میں گھوم رہا ہے۔ مختار صاحب نے حسب عادت لڑکے کو ڈانٹ دیا۔ کیا بکتے ہو۔ مانیٹر نے کہا کہ میں آپ کو اس لڑکے کو دکھاؤں گا۔ مختار صاحب بارہ دری پر کھڑے تھے کہ ایک سفید شٹل کاک والا برقعہ پہنے کوئی ادھر سے گزرا۔ فوراً مانیٹر نے مختار صاحب کو بتایا کہ اسی برقعے میں لڑکا ہے۔ مختار صاحب کو بھی کچھ شبہ ہوا اور انھوں نے آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ برقعہ پوش کو بھی شبہ ہو گیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مختار صاحب نے بھی اپنی رفتار بڑھائی۔ مزمل گیٹ پر پہنچ کر مختار صاحب نے لپک کر اس کے سر پر ہاتھ مارا۔ برقعہ پوش ایک دم بیٹھ گیا اور نیچے سے نکل کر تیزی سے بھاگ گیا اور برقعے کا اوپر والا حصہ مختار صاحب کے ہاتھ میں رہ گیا جسے وہ بے چارگی سے اپنے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

علی گڑھ کی اس صنعتی و زرعی نمائش میں طرح طرح کے کلچرل پروگرام بھی ہوتے ہیں جن میں کھیل کود، سائیکل ریس اور دنگل وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ساتھ شام کو کسی دن قوالی، کبھی مشاعرہ، کبھی کوی سمیلن اور کبھی رقص و موسیقی کی رنگین محفلیں بھی سجتی ہیں۔ نمائش کے مشاعرے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چلبلے طلبہ شعرا پر پھبتیاں کستے نظر آتے ہیں۔ کبھی شیروانی، ٹوپی کے نعرے لگتے ہیں۔ کبھی ان کے اشعار پر فقرے چست ہوتے ہیں۔ کچھ شعرا تو اسٹیج پر جاتے ہوئے ہمت ہار جاتے ہیں۔ بہت کم شعرا کامیاب ہوتے ہیں، اکثر ہوٹنگ کے شکار ہو کر مائک سے ناکام لوٹتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ علی گڑھ کے مشاعرے

کے اسٹیج پر اگر کوئی شاعر کامیاب ہو جائے تو وہ دنیا کے کسی بھی اسٹیج پر ناکام نہیں ہوسکتا۔

ایک شام نمائش میں مشاعرہ تھا۔ بہت دنوں سے یہاں کا مشاعرہ دیکھا اور سنا نہ تھا۔ بہت جی چاہ رہا تھا۔ لہٰذا اپنے کچھ دوستوں اور کرم فرماؤں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ جو منظر دیکھا اور جو اشعار اور جو فقرے سنے آپ بھی سنیے اور لطف اندوز ہوئیے۔ یونیورسٹی کے ایک بہت ذہین طالب علم جمیل احمد نے تو واقعی کمال کر دیا۔ انھوں نے شعرا کے مصرعۂ اولیٰ پر وہ وہ گرہ لگائی کہ سارا مشاعرہ ان کی ذہانت اور برجستگی کا قائل ہو گیا اور داد کی بارش کر دی۔ ملک کے گوشے گوشے سے بہت سے نامور شعرا آئے ہوئے تھے۔ نو بجے رات کو مشاعرہ شروع ہوا۔ کئی مقامی شعرا اسٹیج پر آتے گئے۔ کوئی کامیاب اور کوئی ناکام ہو کر جاتا رہا۔ مشاعرہ سننے کے لیے لوگوں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ ہزاروں لوگوں کی داد یا تو شاعر کو آسمان پر بٹھا دیتی تھی یا ان کی ہوٹنگ اسے پاتال میں پہنچا دیتی تھی۔ اسی درمیان لکھنؤ کے ایک شاعر اسٹیج پر تشریف لائے۔ انھیں عام ڈگر سے ہٹ کر شعر کہنے اور عام الفاظ کے بجائے غیر مروّج الفاظ اپنے اشعار میں استعمال کرنے کا شوق تھا۔ ترنم اچھا تھا۔ انھوں نے غزل شروع کی۔ زمین تھی۔ ''ڈھلتی نہیں پیارے..... گلتی نہیں پیارے۔'' دو مطلعے پڑھے۔ بے جان تھے۔ سامعین کی طرف سے کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ جب انھوں نے تیسرے مطلع کا پہلا مصرع پڑھا: ''نہ ہو گر شمع میں بتی تو وہ جلتی نہیں پیارے۔'' ہمارے جمیل میاں نے اس شعر کو اس طرح مکمل کیا کہ ''ترنم کے سہارے تو غزل چلتی نہیں پیارے۔'' اس مصرعے پر بے ساختہ داد کا شور اٹھا۔ شاعر صاحب بلبلے کی طرح بیٹھ گئے۔

کئی شعرائے کرام تشریف لائے۔ اپنا کلام سنایا اور چلے گئے۔ دہلی کے ایک شاعر کا نام پکارا گیا۔ وہ بہت دیر سے رہ رہ کر کھانس رہے تھے۔ مائک پر آئے، کھانسے اور مصرعہ پڑھا: ''کل سے سکون مجھ کو اے چارہ گر بہت ہے۔'' ہمارے جمیل میاں نے فوراً گرہ لگائی: ''نزلہ تو اب نہیں ہے، کھانسی مگر بہت ہے۔'' اس بار بھی بے ساختہ ہنسی کا شور بلند ہوا۔ احمر دہلوی صاحب کے قدم لڑکھڑا گئے۔ فوراً مائک سے ہٹ گئے اور اسٹیج پر پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔

دہلی کے ہی ایک نوجوان شاعر مائک پر آئے اور پہلا مصرعہ پڑھا۔ ''مری آنکھوں میں میرے دور کی گل کاری ہے۔'' ہمارے جمیل میاں ایک دم اچھل پڑے اور شعر کو بہ آواز بلند اس طرح پورا کیا:

''بدمعاشی ہے، خرافات ہے، مکاری ہے''

جمیل کو لوگوں نے گود میں اٹھا لیا۔ غرض مشاعرہ ہنسی اور داد کی ملی جلی گونج سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ لوگ جھوم رہے تھے اور میاں جمیل کی ذہانت اور حاضر جوابی کی داد دے رہے تھے۔

اسی درمیان رام پور کے کلن خاں صاحب مائیک پر تشریف لائے۔ آواز بڑی کرخت تھی۔ مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔ اپنی غزل کا پہلا مصرعہ اس طرح پیش کیا:

''یہ بے باکی، یہ منہ زوری، کسی دن منہ کی کھاؤ گے''

اس سے قبل کہ وہ مصرعے کو مکمل کرتے ہمارے جمیل میاں نے بہ آواز بلند گرہ لگائی:

''تم اپنی حرکتوں سے اک نہ اک دن جیل جاؤ گے''

بے ساختہ ہنسی کے فوارے اُبل پڑے۔ ہزاروں سامعینِ مشاعرہ جمیل کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ جمیل میاں لوگوں کی داد اور تعریفوں سے اپنی جھولی بھرتے رہے۔ مشاعرے کے زندہ دل ماحول سے ہم لوگ بھی محظوظ ہوتے رہے۔ خاں صاحب غزل پوری نہ کر سکے اور مائیک چھوڑ کر چلے گئے۔

مشاعرے کی صدارت ایک ممبر آف پارلیمنٹ کر رہے تھے۔ وہ بھی اتفاق سے شاعر تھے۔ ان کے نام نامی و اسم گرامی کا اعلان ہوا تو وہ مائیک پر تشریف لائے اور اپنی غزل کا پہلا مصرعہ پڑھا:

''افعال پست فطرت، دعوے بلند و بالا''

ابھی دوسرا مصرعہ پڑھ نہیں پائے تھے کہ جمیل میاں کی رگِ ظرافت پھر پھڑکی اور کھڑے ہو کر اس شعر کو اس طرح پورا کیا:

''یہ دوغلی سیاست کب تک حضور والا''

مشاعرہ داد بیداد کے مدوجزر سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور اختتام کو پہنچا۔ لوگ اچھے شعروں کو دادِ تحسین سے نوازتے اور معمولی اشعار پر خوب ہوٹنگ ہوتی۔ وقت کا پتہ بھی نہ چلا کہ رات کتنی گہرا گئی ہے۔

مشاعرہ رات کے تین بجے ختم ہوا اور سب لوگ دھیرے دھیرے پنڈال چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے لگے۔ ہر شخص مشاعرے کا ذکر کر رہا تھا۔ رات کے تین بجے بھی نمائش پھیکی نہ پڑی تھی۔ سرکس اور جھولے چل رہے تھے۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی بکھری تھی۔ اسی تیز رنگین روشنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم لوگ بھی بشیر بدر کا یہ مطلع گنگناتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے:

یوں ہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے، اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment,
Near Shamshad Market,
Aligarh Muslim University, Aligarh-202002

شعیب رضا فاطمی

(رپورتاژ)

گوہاٹی اردو میلہ

صبح کے دس بجے ہیں اور شہر کے ایک سرے پر واقع فلم ڈویژن کے سرکاری پویلین کا گیٹ نمبر 3 منتظر ہے 18 تاریخ تک برپا ہونے والے" اردو میلہ" کا۔ صدر دروازے سے داخلے کے بعد وسیع میدان میں بانس کی بلیوں سے بنا ہوا دلکش پنڈال اور خوبصورت اسٹیج جس پر رنگین کپڑوں کی سجاوٹ سے دلکش پینٹنگ کا گمان ہوتا ہے بائیں طرف پندرہ بائی بیس کی 35 دکانیں جن میں سلیقے سے لگی ہوئی کتابیں اور دکانوں کی پیشانی پر اردو اور انگریزی زبان میں تحریر پبلشرس کے نام، جدید ٹیکنالوجی کی زبان سے ہم آہنگی ثابت کرتی ہوئی سی. ڈی. کیسٹ اور ڈی. وی. ڈی. کی دکانیں، خطاطی کی عمدہ مثالیں بصورت طغرہ سورج کی روشنی میں اپنے فنکار کو بے ساختہ داد دلوا رہی ہیں۔ " کلا کھیتر" کا یہ حصہ اپنی آن بان اور شان کے ساتھ سہ پہر کا منتظر ہے جب آسام کے وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں میلے کا افتتاح ہونا ہے۔

گوہاٹی کے لیے یہ تاریخی دن ہے کیونکہ آزادی کے بعد پہلی بار یہاں اردو کے نام پر اس قدر تیاریوں کے ساتھ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ ایک ہفتے تک چلنے والے اس میلے میں نہ صرف کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا ہے بلکہ ہر روز ثقافتی پروگرام کے تحت علاقائی کلچرل پروگرام کے ساتھ ساتھ ملک کے مشہور ڈراما گروپ اپنے فن کا مظاہرہ بھی کریں گے۔

ہندوستان کے شمال مشرقی علاقے کا یہ شہر پہاڑوں اور جنگلات کی قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔ عام طور پر یہاں آسامی زبان رائج ہے۔ موسم معتدل ہے۔ جنوری کے مہینے میں 15 سے بیس ڈگری ٹمپریچر صحت بخش موسم کی دلیل ہے۔ اب گیارہ بج رہے ہیں اسٹیج پر حبیب تنویر ڈراما گروپ شام میں ہونے والے ڈرامے " آگرہ بازار" کی ریہرسل شروع کر چکا ہے۔ اسٹیج پر ایک طرف پتنگ والے کی دکان ہے اور ایک طرف کتاب کی دکان، درمیان میں تین دکانیں ہیں جن کے سامنے لڈو اور ککڑی والے اپنی اپنی ٹوکریاں لیے بیٹھے ہیں۔ دو فقیر " دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی" اپنے مخصوص انداز میں گاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

یقیناً ڈرامے کا انتخاب برمحل ہے۔ 18 ویں صدی کے شاعر نظیر اکبرآبادی کی شاعری اور اس دور میں آگرے کی سماجی صورت حال پر مبنی یہ ڈراما آسام کی دیہی تہذیب سے بہت میل کھاتا ہے۔ خود ڈاکٹر علی جاوید کی منشا بھی یہی ہے کہ بڑے بڑے اردو کے مراکز میں اردو تہذیب و ثقافت کی بات تو ہوتی ہی رہتی ہے ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ایسے خطوں میں اردو تہذیب و روایت کی بات کی جائے جہاں لوگ آج بھی فطرت کی آغوش میں جینے کے باوجود ایک رنگین و شیریں زبان سے نا آشنا ہیں جس کے سوتے ہندوستان کی مٹی سے پھوٹے ہیں اور جس زبان نے ہمیشہ جبر و ظلم کے خلاف اپنا سینہ سپر کیا ہے۔ اس زبان کا یہ حق ہے کہ اسے ملک کے قریہ قریہ میں عام لوگوں کے سامنے اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا جائے تاکہ امن و سکون کی متلاشی دھرتی پھر سے اپنے مرکز کی طرف لوٹ سکے۔ ڈاکٹر جاوید ساجھی برادری کے علم بردار ہیں اور ہندوستان میں جمہوریت کی بقا کو وہ اردو تہذیب میں مضمر گردانتے ہیں۔

دھیرے دھیرے لوگوں کی آمد شروع ہوگئی چاروں طرف لوگ مختلف ٹولیوں میں گشت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ سکیوریٹی کے پیش نظر پولس اہلکار بھی نظر آنے لگے ہیں۔ تقریباً تین بجے ہی ایک سکیوریٹی گروپ نے اسٹیج اور تمام پنڈال کی کڑی پڑتال شروع کر دی۔ ریہرسل مکمل ہو چکا ہے اور اب اسٹیج پر مخصوص کرسیاں لگائی جا رہی ہیں۔ ابھی 4 بجے ہیں ایک ہزار سے زیادہ نشستیں بھر چکی ہیں بہت سے لوگ آس پاس چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ساڑھے چار بجے معزز مہمان تشریف لے آئے۔ ڈائرکٹر صاحب اور ان کے دیگر رفقا نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ پہلے انھوں نے پنڈال کے دروازے پر فیتہ کاٹ کر کتاب میلے کا افتتاح کیا اور پھر ایک خاص قسم کا دیا جلا کر باضابطہ اردو میلے کا افتتاح کیا اور کتابوں کے معائنے کے لیے ان کا پورا قافلہ کتاب میلے میں داخل ہوگیا۔ ایک ایک دکان پر جا کر انھوں نے کتابیں دیکھیں اور تمام پبلشرس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسٹیج پر تشریف لے آئے۔ اسٹیج پر سات کرسیاں نظر آئیں جن میں بیچ کی کرسی پر خود وزیر اعلیٰ متمکن ہوئے۔ ان کی داہنی جانب حبیب تنویر صاحب اور پھر ڈاکٹر علی جاوید تشریف فرما ہیں۔ بائیں طرف وزیر اعلیٰ، کے رفیق دیرین دتا کمشنر ایلمنٹری اور سکنڈری ایجوکیشن سہراب علی، جوائنٹ سکریٹری ایجوکیشن اور واجد علی چودھری چیئرمین ہاؤسنگ بورڈ تشریف فرما ہیں۔ استقبالیہ پروگرام کے تحت ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ آف آسام کی جانب سے وزیر اعلیٰ ترون گوگوئی، پدم شری حبیب تنویر اور ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر علی جاوید کا استقبال کیا گیا اور پھر ڈاکٹر علی جاوید افتتاحی تقریر کے لیے مائک پر تشریف لے آئے۔

درمیانہ قد، سفید بال مضبوط کاٹھی اور کتابی چہرے کے مالک ڈاکٹر علی جاوید کی شخصیت کو ان کی روشن اور بڑی بڑی آنکھیں پروقار بنا دیتی ہیں۔ سادہ

طبیعت کے مالک علی جاوید صاحب معمولی سے کرتے پاجامے میں ملبوس ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں یا یوں کہیں کہ مسکراہٹ بھی ان کی شخصیت کا حصہ ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ بہت ہی صاف اور سلیس زبان میں انھوں نے وزیراعلیٰ تردن گوگوئی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گوہاٹی کے عوام کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا اور پھر ''اردو میلہ'' کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ میں وزیراعلیٰ آسام کی توجہ ریاست میں اردو کی صورتِ حال کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہاں اردو زبان کے فروغ کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں میری ان سے درخواست ہے کہ وہ گوہاٹی یونیورسٹی میں بند پڑے شعبۂ اردو کو پھر سے قائم کریں، ساتھ ہی اسکولوں میں بھی اردو بطور زبان پڑھائی جائے اس کا انتظام کریں۔ ایک درخواست یہ بھی ہے کہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان گیر پیمانے پر ہر ریاست میں اپنا ایک ریجنل سنٹر قائم کرنا چاہتی ہے ضرورت ہے کہ اس کے لیے معقول زمین کی فراہمی ریاستِ آسام کے وزیراعلیٰ گوہاٹی شہر میں کریں تاکہ ہم باضابطہ عمارت کی تعمیر کرکے اس میں ریجنل سنٹر قائم کرسکیں۔ انھوں نے عوام کو یہ خوش کن خبر بھی سنائی کہ بہت جلد ہم ''آسامی زبان کے ذریعے اردو کیسے سیکھیں'' موضوع پر کتاب شائع کریں گے۔ اس سے پہلے منی پوری زبان کے ذریعے ''اردو سیکھیں'' پر کتاب دستیاب ہوجائے گی جو ابھی طباعت کے مرحلے میں ہے۔ اس کے علاوہ اگر عوام کی طرف سے درخواست دی جاتی ہے تو ہم یہاں مزید اردو عربی اور کمپیوٹر کے سنٹرس قائم کریں گے۔

ڈاکٹر علی جاوید نے اردو زبان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ پورا ملک 1857 کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منا رہا ہے۔ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کی جدوجہد میں جس زبان نے فعال رول ادا کیا وہ اردو زبان ہے۔ مہاتما گاندھی ہوں یا بھگت سنگھ یا رام پرساد بسمل ان کی زبان اردو رہی ہے اور اردو نے بھی انھیں کی طرح کبھی بھی جبر واستبداد یا ظلم کا ساتھ نہیں دیا۔ اقبال کا ''ترانۂ ہندی'' — ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ہو یا بھگت سنگھ کا دیا ہوا نعرہ ''انقلاب زندہ باد'' اردو کے تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ اردو ہمیشہ ہی انقلاب و احتجاج کے ساتھ اتحاد، امن، دوستی اور محبت کی زبان رہی ہے اس زبان کی ایک تہذیب ہے جس میں انسانی مساوات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر اسے کسی مخصوص مذہب سے جوڑ دیں گے تو پریم چند، چکبست اور رتن ناتھ سرشار سے لے کر فراق گورکھپوری، آنند نرائن مُلّا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، گیان چند جین، رتن سنگھ یا پھر جوگندر پال کو کہاں رکھیں گے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان اور اس کی اصناف کی آبیاری میں گزار دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں گوہاٹی کے عوام کی اردو سے محبت کو دیکھ کر حیران ہوں اور یہ ثبوت ہے کہ اردو زبان ہندوستان گیر پیمانے پر مقبول ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کے بیچ کوئی خاص فرق نہیں ہے اس کی مثال آج شام میں آپ دیکھیں گے جب حبیب تنویر اردو زبان کے ایک بڑے شاعر نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے متعلق ڈراما ''آگرہ بازار'' پیش کریں گے اور کل اسی گروپ کے ذریعے رابندر ناتھ ٹیگور کے ناول پر مشتمل ڈراما ''راج رکت'' پیش کیا جائے گا۔

ان اہم نکات پر نہایت اختصار سے روشنی ڈالتے ہوئے ڈائرکٹر علی جاوید نے تقریر ختم کی اور پھر وزیراعلیٰ آسام تردن گوگوئی نے آسامی زبان میں اپنی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم شکرگزار ہیں کہ قومی اردو کونسل نے گوہاٹی میں اردو میلے کا اس بڑے پیمانے پر انعقاد کیا ہے۔ میں علی جاوید صاحب کے اس خیال سے متفق ہوں کہ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی علاقہ (وزیراعلیٰ کی زبان آسامی تھی اور میں آسامی سے نابلد، خیر گزری کہ میرے ساتھ والی کرسی پر ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹر رشمی شرما بیٹھی تھیں، انھوں نے وقفے وقفے سے وزیراعلیٰ آسام کی تقریر کا ہندی ترجمہ سرگوشی میں مجھے بتانا شروع کیا اور میں قلمبند کرتا گیا) وزیراعلیٰ تقریر فرما رہے تھے، زبان عوام کی جاگیر ہوتی ہے یہ زبان کی اپنی خوبی پر منحصر ہے کہ اسے کتنے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کا سوال ہے جس زبان نے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جیسی نظم ہم ہندوستانیوں کو دی ہو اس زبان کا تعلق کسی خاص مذہب یا علاقے سے کیسے ہوسکتا ہے؟ وزیراعلیٰ نے گوہاٹی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے جلد از جلد قیام کی یقین دہانی کرائی اور کہا کہ اسکول اور کالج کی سطح پر بھی اردو زبان کے فروغ کی کوششیں کی جائیں گی اور ساتھ ہی گوہاٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ریجنل سنٹر کے قیام کے لیے جگہ بھی فراہم کی جائے گی۔ اس خوش خبری پر تالیوں کی تیز گڑگڑاہٹ سے سارا پنڈال گونج گیا۔

افتتاحی تقریب کا اختتام ہوا اور ایسے میں عام روایت کی طرح ہٹو بچو کا نعرہ، عام لوگوں کی تیز اور دھیمے لہجے میں بات چیت، کرسیوں کے کھسکائے جانے کی آواز، چائے کافی کے لیے لوگوں کی آوا جاہی، وزیراعلیٰ کا قافلے کے ساتھ رخصت ہونا وغیرہ تقریباً نصف گھنٹے تک چلتا رہا اور پھر دھیرے دھیرے ماحول پرسکون ہوا۔ ناظرین اب آج کا ڈراما ''آگرہ بازار'' دیکھنے کے لیے پھر اپنی نشستوں پر قبض ہوچکے تھے۔ اسٹیج پر پردہ گر چکا تھا۔ اندر کچھ لوگوں کے ادھر ادھر ہونے کا احساس ہورہا تھا۔ پھر پردہ دھیرے دھیرے سرکتا ہوا دونوں جانب سمٹ گیا۔ اسٹیج پر روشنی تیز ہوگئی۔ اسٹیج کی ایک جانب پتنگ کی دکان کے تھڑے پر ایک آدمی سویا پڑا ہے اور دوسری طرف کتاب کی دکان پر تین لوگ ادبی صورتِ حال پر گفتگو کررہے ہیں۔ سامنے ایک مٹی کے برتن والے کی دکان ہے اور ایک لالہ کی سامنے کی دکان کے آگے تین لوگ ٹوکریوں میں ککڑی، ملاّ و اور تربوز لیے بیٹھے ہیں۔ ماحول پوری طرح کسی چوراہے کا ہے۔ اسی دوران ایک طرف سے تین درویش ہارمونیم ڈھول وغیرہ کے ساتھ شہرآشوب گاتے

ہوئے داخل ہوتے ہیں:

''جب آگرے میں سب کا ہوا کاروبار بند''

یہ ڈراما سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے ہندوستان بالخصوص دہلی اور آگرے میں ادبی وتہذیبی صورتِ حال کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر نظیر کی نظموں اور ان کی عوامی مقبولیت کے پس منظر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریزوں کی آمد اور جدید تہذیب وتمدن کی روز افزوں ترقی کو اور عام انسانوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو شرفا پسند نہیں کرتے۔ سماج صاف صاف دو طبقوں میں تقسیم ہے، ایک طبقہ قلیل ہی سہی شرفا کا ہے اور بڑا طبقہ شرفا کی اصطلاح میں رذیلوں کا ہے۔ نظیر عام انسانوں کے شاعر ہیں، انھیں نہ تو اس کی فکر ہے کہ ہمارا مقام کیا ہے اور نہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمیں کس طبقے کی نمائندگی کرنی چاہیے بلکہ ان کی سیدھی نظر عوام کے مسائل پر ہے۔ وہ انسانوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ معاشرے میں یگانگت کے قائل ہیں اور ان کی شاعری مذہب وملت کے کٹھگھرے میں بار نہیں پاتی اسی لیے شرفا ان کی شاعری پر ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ڈرامے میں قومی یکجہتی کے حوالوں کو نظیر کی شاعری کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے خاص طور پر کرشن جی پر لکھی ہوئی نظیر کی نظم کو بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے میں حبیب تنویر نے کرداروں کے ذریعے جس خوبصورتی سے اس عہد کی مرقع کشی کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ تقریباً 3 گھنٹے پر محیط اس ڈرامے میں نظیر کی چودہ نظموں کو شامل کیا گیا ہے اور تقریباً 40 کردار مل کر اس پورے ڈرامے کو اختتام تک پہنچاتے ہیں۔ نظیر کا کردار ڈرامے میں نہیں ہے، ان کی نمائندگی پتنگ والا کرتا ہے جس کی دکان پر نظیر کے ہمنوا بیٹھتے ہیں۔ کتاب کی دکان پر نظیر کے مخالفین کا جماوڑا ہوتا ہے۔ آخر میں حبیب تنویر صاحب نے تمام کرداروں کا نام بہ نام تعارف کرایا اور رات دس بجے تک پہلے دن کا پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ رات کے کھانے کا انتظام بھی پنڈال کے قریب ہی ایک کینٹین میں تھا۔

13 جنوری صبح کے 11 بجے سے ہی مقامی لوگ کتاب میلے میں آنے لگے ہیں لیکن دکانوں کے کھلنے کا وقت دو بجے دن سے مقرر ہے لہٰذا مایوسی لوگوں کے چہرے پر صاف پڑھی جارہی ہے۔ اسٹیج پر حبیب تنویر گروپ کے لوگ رابندر ناتھ ٹیگور کے ناول پر مشتمل ڈرامے ''راج رکت'' کی ریہرسل میں منہمک ہیں کچھ مقامی لوگ انھیں ریہرسل کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ مقامی لوگوں کے لیے یہ ''اردو میلہ'' ایک بالکل نئے طرز کی تفریح ہے۔ اکثر لوگ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں یہ پوچھتے پائے گئے کہ آخر یہ سب کیوں ہورہا ہے؟ ایک دن پہلے وزیراعلیٰ کے اس اعلان پر لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی کہ گوہاٹی میں قومی اردو کونسل کا ریجنل دفتر قائم ہوگا اور آسام کی ریاستی حکومت اس کے لیے زمین فراہم کرے گی۔ مقامی اخبارات نے اس خبر کو شہ سرخی میں شائع کیا تھا۔ اس خبر کو پڑھ کر بھی لوگ آرہے تھے لیکن سارے چہروں پر تجسس تھا۔ دوپہر میں یہاں کا موسم تقریباً دو گھنٹوں کے لیے کافی گرم ہوجاتا ہے لیکن جیسے جیسے سورج غروب ہونے لگتا ہے موسم میں خنکی بڑھنے لگتی ہے۔ تین بجے کے بعد کتاب میلے میں اردو کے شائقین کی کافی بھیڑ دیکھی گئی لیکن ان میں زیادہ تر لوگوں کی زبان مقامی تھی اور وہ بڑے تاسف سے اردو کی کتابیں الٹ پلٹ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ اس زبان کے نہ جاننے پر متاسف ہیں۔ سرکاری سطح پر اسکولوں میں اردو کے نہ پڑھائے جانے کا شکوہ لوگ بار بار کررہے تھے لیکن کچھ لوگ کافی پرامید نظر آئے۔ جب اس سلسلے میں میں نے ایک مقامی نوجوان محمد ابرار سے بات کی تو اس نے پرامید لہجے میں کہا کہ کل وزیراعلیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھائے جانے کا انتظام کریں گے۔ کاش اس طرح کا پروگرام یہاں پہلے منعقد کیا گیا ہوتا۔

شام کے چھ بجے تک پنڈال میں کافی بھیڑ جمع ہوچکی تھی ڈرامے سے پہلے آج مقامی اپنا گروپ نے دیودھانی رقص پیش کیا جسے مقامی لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ تقریباً 7 بجے پروگرام کے مطابق ''راج رکت'' کے لیے پردہ اٹھا۔ یہ ڈراما قدیم ہندوستان میں پھیلی ضعیف الاعتقادی کے خلاف احتجاج پر مبنی تھا جسے ٹیگور نے 19ویں صدی میں تخلیق کیا تھا۔ حبیب تنویر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی کہانی یا ناول کے تھیم کو لے کر اسے اس طرح اسکرپٹ کی شکل دیتے ہیں کہ کہانی بالکل ایک جدید تخلیق کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ راج رکت بھی ٹیگور کے دو ناولوں پر مبنی ہے جس میں دیوی دیوتاؤں کے سامنے اولاد کے لیے جانوروں کی قربانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈراما راجاؤں کے دور میں تری پورہ ریاست کے ایک ترقی پسند راجہ کا ہے جس کے کوئی اولاد نہیں ہے وہ قربانی کی اس روایت کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن سماج پر مذہبی اداروں کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ راجہ کو اس سلسلے میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ اس کی بیوی اور اس کا بھائی اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں اور اس کے پالے ہوئے بچے کو دیوتا پر قربان کرنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ راجہ کو پتہ چل جاتا ہے تو وہ بچے کو بچالیتا ہے اور بھائی کو سزا دے کر ریاست سے نکال دیتا ہے لیکن بھائی دوسری ریاست کے حکمراں سے ساز باز کرکے راجہ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ راجہ جو مخالفتوں سے لڑلڑ کر تھک آچکا ہے بددل ہوکر بھائی کے خلاف جنگ نہ لڑنے کا اعلان کردیتا ہے اور بچے کو لے کر ریاست چھوڑ دیتا ہے۔

رات کے تقریباً 9 بجے اس کامیاب ڈرامے کا اختتام ہوا۔ حبیب تنویر اسٹیج پر آئے اور کرداروں کے تعارف کے بعد گویا ہوئے۔

''میں بے حد ممنون ہوں گوہاٹی کے عوام کا۔ یقیناً اس ڈرامے کا یہ حق تھا کہ اسے عوام اس دلچسپی سے دیکھیں رابندر ناتھ ٹیگور آسام کے بہت قریب کلکتہ کے رہنے والے تھے اور آسام کے لوگ بنگلہ زبان بھی بخوبی بولتے اور

سمجھتے ہیں۔ انھوں نے وضاحت کی کہ دنیا کی تمام زبانیں خوبصورت ہیں خود انگریزی زبان نے بھی ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا سوال ہے تو اس زبان نے کبھی کسی زبان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہر زبان کی خوبی کو اپنے اندر داخل کرلیا، یہی وجہ ہے کہ شمال تا جنوب اور مشرق تا مغرب یہ زبان پھیلتی ہی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آسامی زبان اردو کے قریب آتی ہے تو یقیناً آسامی کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔'' بعد ازاں ڈائرکٹر قومی کونسل نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ دو دنوں سے جس طرح آپ اس پروگرام میں جوش وخروش سے حصہ لے رہے ہیں یقیناً آئندہ بھی یہ جوش وخروش برقرار رہے گا۔ انھوں نے سامعین سے کہا کہ کل یعنی 14 جنوری کو حیدرآباد کے مشہور سنگر جناب وٹھل راؤ جی آپ کو غزلیں سنائیں گے یقیناً کل آپ اس اہم پروگرام کو مس نہیں کریں گے۔

غزل سے مراد ہے محبوب سے باتیں کرنا، اب آپ کا محبوب خدا بھی ہوسکتا ہے، کوئی دوشیزہ بھی ہوسکتی ہے، انقلاب بھی، وطن بھی اور زبان بھی، غزل کے دامن میں سب کچھ سمیٹا جاسکتا ہے۔ غزل کے دامن کی یہ وسعت اردو کی ودیعت ہے۔ اس زبان نے دنیا میں رائج زبانوں کے لاتعداد الفاظ کو اپنے اندر سمولیا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے کسی ملک، کسی زبان، کسی مذہب، کسی فرقے اور کسی قبیلے سے بیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے شیدائی ساری دنیا میں موجود ہیں۔ شمال مشرق کی جانب ہم اردو کے چاہنے والوں کی تلاش میں آئے ہیں اور تین دنوں سے آپ کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو زبان صرف محبت کی زبان ہے۔ آپ کی اردو سے یہ محبت اردو کی تہذیب سے محبت ہے اس تہذیب سے جس تہذیب میں سانجھی وراثت کی خوشبو ہے۔

''اردو میلہ'' کی تیسری شب، اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے حیدرآباد سے تشریف لائے وٹھل راؤ جی کو غزل سرائی کی دعوت دی اور ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ وٹھل راؤ جی کا تعلق اردو کے ایک قدیم اور بڑے مرکز حیدرآباد سے ہے۔ آپ مخدوم محی الدین کے شہر سے آئے ہیں اور ان کے شاگرد بھی ہیں، مجھے امید ہے آپ ان کی سحرانگیز گائکی کو مدتوں بھلا نہ پائیں گے۔''

غزل کے اس پروگرام سے پہلے منی پوراپٹا اور ناراسنگھ گروپ نے بے حد کامیاب ثقافتی پروگرام پیش کیا تھا جس میں کتھک ڈانس، اوڈیسی، بھنگڑا، طبلہ نوازی، کورس گیت، مارشل آرٹ اور ڈانس ڈراما شامل تھا۔ خاص طور پر فلم ''امراؤ جان'' کے اس نغمے کو

دل چیز کیا ہے آپ مری جان لیجیے
بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے

بڑی خوبصورتی سے ایک مرد آرٹسٹ نے پیش کیا۔ طوائف کے میک میں فن کا یہ مظاہرہ قابلِ دید بھی تھا اور قابلِ داد بھی۔

اس بیچ وٹھل راؤ جی اور ان کے ہمنوا اپنے ساز درست کرتے رہے اب وہ بالکل تیار ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے نہایت ادب سے ایک منقبت پیش کی:

بہ طفیلِ دامنِ مرتضیٰ میں بتاؤں کیا مجھے کیا ملا
کہ علی ملے تو نبی ملے جو نبی ملے تو خدا ملا
تو کریم ابن کریم ہے ترا فیضِ فیضِ عظیم ہے
ترے در سے جو بھی ملا مجھے مرے حوصلے سے سوا ملا
تو اسی کی آنکھ کا نور ہے تو اسی کے دل کا سرور ہے
کہ جسے بلند نظر ملی کہ جسے شعور انا ملا
وہی تیرا کاملِ باوفا وہی رات دن ترا تذکرہ
تری یاد ہے مری زندگی تری یاد ہی میں مزہ ملا

پوری محفل روحانی ہوگئی تھی ایک عجیب سی متبرک خاموشی میں منقبت کا اختتام ہوا اور سامعین بے تحاشہ تالیاں بجانے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے معظم جاہ کی غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

وہ جو مہمان بنے بیٹھے ہیں
میرا ایمان بنے بیٹھے ہیں

ضیا جبل پوری کی غزل:

لاکھ ڈھونڈا نظر نہیں آتا
تیرا چہرہ نظر نہیں آتا

ساغر صدیقی کی غزل:

شیشے کا بدن لے کر پھرتے نہیں راہوں میں
پتھر بھی چھپے ہوں گے لوگوں کی نگاہوں میں

سنائی اور پھر مخدوم محی الدین کی مشہور نظم ''چارہ گر'' اپنے مخصوص انداز میں سناتے رہے اور میں مجمع میں بیٹھے سامعین کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جو صورتِ تصویر بنے بیٹھے تھے۔ حالانکہ سامعین میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو مقامی زبان کے علاوہ دوسری زبان نہیں آتی لیکن ان کی محویت کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ فن کا جادو ہر بشر کے دل میں گھر کرتا ہے۔

اس بیچ وٹھل راؤ جی نظم کے اس بند پر پہنچ چکے تھے:

یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
اک چنبیلی کے منڈوے تلے

سامعین کی کثیر تعداد سحر زدہ ہوگئی تھی۔ سامنے کے صوفے پر دہلی سے آج

ہی تشریف لائے ڈاکٹر ابوبکر عباد (کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر) بیٹھے تھے ان کے ساتھ ''راشٹریہ سہارا'' کی اسپیشل کورس پونڈنٹ محترمہ فرحت رضوی، انسپکٹر جنرل آف پولیس جناب چندر ناتھن اور ان کی اہلیہ تشریف فرما تھیں۔ ڈائرکٹر صاحب شاید کسی فرمائش کے لیے اسٹیج پر جاکر ڈھل راؤ جی کے قریب بیٹھ گئے ہیں فضا میں مخدوم کا یہ بند گونج رہا ہے:

ہم نے دیکھا انھیں دن میں اور رات میں
نور ظلمات میں، ہم نے دیکھا انھیں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
اک چنبیلی کے منڈوے تلے

جانے یہ الفاظ کا سحر تھا یا ئسر کا کمال کہ تمام حاضرین یک گونہ لطف و انبساط کی فراوانی سے سرشار ہو اٹھے تھے۔ رات کے دس بجے یہ سحر بھی آخر ٹوٹا اور اس تاریخی شب کا اختتام ہوا۔

وقت کی پرواز رکتی کہاں ہے 15 جنوری 2008 آج میلے کا چوتھا دن ہے اور تھوڑی ہی دیر میں شب کی سیاہی پھیلنے والی ہے۔ آج یہاں مشہور تھیٹر آرٹسٹ اور ایک جنٹ ڈراما گروپ کی نگراں محترمہ نادرہ ببر جلوہ افروز ہیں۔ پنڈال کے باہر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ خود اور ایک کرسی پر ان کی بیٹی جوہی ببر بیٹھی ہیں۔ آج کا پروگرام کھلے اسٹیج پر نہ ہوکر آڈیٹوریم میں ہونا طے ہوا ہے اور ناظرین کافی تعداد میں آنے لگے ہیں۔ پروگرام سے پہلے میلے میں قابل ذکر بھیڑ ہوتی ہے کسی ایسے علاقے میں جہاں اردو زبان لوگوں کے دلوں میں قصۂ پارینہ کی طرح زندہ ہو کتابوں کی خریداری چہ معنی دارد؟ لیکن ایسا نہیں ہے لوگ کتابیں بھی خرید رہے ہیں اور اپنے دوست احباب کے ساتھ بچوں کے ساتھ میلے میں شرکت کر رہے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آسام میں اردو زبان کو آج سے پہلے عام طور پر لوگ صرف ایک مذہب کی زبان سمجھتے تھے لیکن اب لوگوں کا بھرم ٹوٹا ہے اور کثیر تعداد میں ایسے لوگ اس میلے میں شریک ہو رہے ہیں جنھیں ہندوستانی ثقافت عزیز ہے۔

تقریباً 5 بجے تک آڈیٹوریم کی تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ آسام میں دو روزہ ''بیہو'' کے تہوار کا آج آخری دن ہے اور سرکاری چھٹی ہے۔ یہ تہوار یہاں کے اہم تہواروں میں سے ایک ہے جس میں ہر خاندان کے لوگ اپنے گھر سے الگ ایک جھونپڑہ بناتے ہیں اس میں ایک شب کی رہائش اختیار کرتے ہیں، انواع و اقسام کے کھانے بناتے ہیں، کھاتے ہیں اور پھر صبح ہوتے ہی اس گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔ عام طور پر بازار میں اس تہوار سے متعلق جو چیزیں نظر آئیں وہ چاول کے آٹے اور سفید و کالے تل سے بنی چیزیں تھیں۔ تل اور گڑ کے لڈو بھی بازاروں میں کافی دیکھے گئے۔

7 بج چکے ہیں آڈیٹوریم میں پروگرام کے لیے چونکہ آج ہی فیصلہ لیا گیا تھا اس لیے تھوڑی تاخیر ہوئی ہے لیکن یہ مرحلہ بھی ختم ہوگیا۔ اسٹیج کا کالا پردہ سرک رہا ہے اور سامنے تھا ''بیگم جان'' کا پہلا سین، ایک خوبصورت سی لڑکی (جوہی) زرینہ، اس کا کرایہ دار شہر جیونتی ایک گھر کے ڈرائنگ روم میں کھڑے ہیں۔ لڑکا اس گھر میں کرایہ دار آیا ہے لیکن اس کا مقصد کرایہ دار بن کر اس مکان کی مالکن بیگم جان سے راہ و رسم بڑھانی ہے تاکہ... لیجیے پہلے آپ اس کہانی کا تھیم سمجھ لیں۔

اس کہانی کا زمانہ تقسیم سے قبل اور بعد کا ہے۔ بیگم جان جو تقسیم سے قبل پیشے کے اعتبار سے ایک مشہور طوائف تھیں۔ ان کی ٹھمری اور غزلوں کے دیوانے مہاراجہ پٹیالہ سے لے کر ملک کے بڑے بڑے سیاسی رہنما بھی تھے اب بعد از تقسیم، گمنامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ عام خبر یہ ہے کہ بیگم جان کا انتقال ہو چکا ہے لیکن کچھ لوگ جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ نیوز چینل اور اخبارات کے رپورٹرس اس لیے ان کے گھر کا چکر لگاتے ہیں تاکہ کچھ سیاسی لیڈروں کے خطوط ان سے حاصل ہوجائیں جو بیگم جان کے پاس محفوظ ہیں۔ ڈرامے میں کرایہ دار کے رول میں ایسا ہی ایک کردار ہے۔ موقع ملتے ہی وہ بیگم جان کو اس بات سے آگاہ بھی کردیتا ہے کہ میں آپ کے پاس کس لیے آیا ہوں۔ بیگم جان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی جوان اور خوبصورت نواسی کو اس سے منسوب کرنا چاہتی ہے۔ رپورٹر اس چال کو تاڑ جاتا ہے اور بالآخر وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ بیگم جان کا بھی انتقال ہوجاتا ہے اور ان تاریخی خطوں کا معمہ حل نہیں ہوتا کہ وہ اصلی ہیں یا نہیں۔

ڈراما میں بیگم جان کے حوالے سے کئی باتیں کہنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ خاص طور پر سماجی اقدار کی تبدیلی، فن موسیقی کا زوال، بے نام رشتوں کی پاسداری اور ایک خوبصورت جوان لڑکی کا یہ کرب، چونکہ وہ بیگم جان کی نواسی ہے اس لیے اس کی خوبصورتی صرف رونق محفل کے لیے ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک گھر دینے والا کوئی نہیں۔ ''بیگم جان'' میں نادرہ ببر ان تمام الجھنوں کے بیچ ماضی کی یادوں سے ہاری لیکن بظاہر طمطراق کی زندگی گزارے جارہی ہیں۔ کہانی کا اختتام المناک ہے۔ ڈرامے کی محاوراتی اور خالص اردو زبان نے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ کہانی کا اختتام المناک ہے۔ 2002 سے 2008 تک اس ڈرامے کے ملک اور بیرون ملک میں تقریباً 200 کامیاب شوز ہو چکے ہیں۔

''ڈراما'' کے اختتام پر ڈائرکٹر قومی کونسل نادرہ ببر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سامعین سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں نادرہ ببر سجاد ظہیر کی بیٹی ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے ذریعے اردو کے فروغ کا سامان کیا تھا

اور آج نادرہ ان کے نقش قدم پر چلتی ہوئی ساری دنیا میں اردو کا چراغ جلا رہی ہیں۔ ناظرین نے تالیوں کے شور میں ڈاکٹر جاوید صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وساطت سے گوہاٹی کے لوگ ایسا خوبصورت ڈراما دیکھ سکے۔ ہال میں اضافی کرسیاں لگانے کے باوجود تل رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ باہر آنے پر معلوم ہوا کہ آدھے لوگ واپس چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور کامیاب پروگرام کا اختتام ہوا۔

ایک ایک دن گزرتا جارہا ہے گوہاٹی میلہ اختتام کے قریب آتا جارہا ہے۔ پورے ملک سے فنکاروں کے آنے اور جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ شہر کے چار ہوٹلوں میں کمرے ریزرو ہیں۔ اس کے علاوہ پولس گیسٹ ہاؤس میں بھی مخصوص مہمانوں کے لیے کمرے بک کرائے گئے ہیں۔ دہلی سے اتنی دور اس پروگرام کے انعقاد میں مقامی لوگوں کا تعاون تو ہے ہی ساتھ ہی یہاں کے آئی جی جناب چندر ناتھن کی خصوصی دلچسپی سے پروگرام کے دوران کسی قسم کی بدنظمی نہیں ہوئی۔ آئی جی آسام پولس کا تعلق حیدرآباد سے ہے لیکن وہ مستقل طور پر دہلی میں رہ رہے ہیں۔ آسام میں ان کی پوسٹنگ ہمارے لیے فالِ نیک ثابت ہورہی ہے۔

آج 16 جنوری ہے اور آج کی شام فلم کی مشہور ہیروئن سونالی بیندرے اور مشہور تھیٹر آرٹسٹ فاروق شیخ کا ڈراما ''آپ کی سونیا'' کا مظاہرہ ہونا ہے۔ کسی فلم آرٹسٹ کی آمد سے عوام میں جس طرح کا جوش ہونا چاہیے وہ یہاں بھی ہے پورے دن کتاب میلے میں بھیڑ دیکھی گئی۔ شام ہوتے ہی لوگ پنڈال کی سیٹوں پر قبضہ جما چکے تھے۔ ایک بڑی تعداد فوجی اور پولیس افسران کی بھی تھی۔ معقول حفاظتی انتظامات میں تقریباً 7 بجے ڈراما شروع ہوا۔ دو کرداروں، فاروق شیخ اور سونالی بیندرے پر مشتمل اس ڈرامے کا اسکرپٹ جاوید صدیقی نے لکھا ہے۔ اس ڈرامے میں سونالی بیندرے سونیا کا کردار ادا کرتی ہے جو فرانس میں مقیم ہے اور فاروق شیخ سید ذوالفقار حیدر کے کردار میں ہیں اور وہ ہندوستان میں ہیں۔

کہانی یوں ہے کہ ذوالفقار حیدر اپنے زمانے کی ایک مشہور پینٹر امرتا سے عشق کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ خود سیاست میں فعال ہیں لیکن امرتا جسے وہ حاصل نہیں کرپاتے کا انتقال ہونے کے بعد وہ سیاست سے دستبردار ہوجاتے ہیں اور اپنی مایوس زندگی کی گاڑی کو کسی طرح گھسیٹ رہے ہیں۔ یہ کہانی کا بیک گراؤنڈ ہے۔ اب ڈراما یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ایک دن یکا یک ذوالفقار حیدر کے پاس فرانس سے ایک خط کسی سونیا کا آتا ہے جو خود کو امرتا کی بیٹی بتاتی ہے اور ثبوت کے طور پر امرتا کا ایک خط بھجواتی ہے۔ وہ امرتا کی زندگی کے بارے میں ذوالفقار حیدر سے چبھتے ہوئے سوالات کرتی ہے۔ ذوالفقار حیدر کبھی خوشی سے کبھی غصے سے اور کبھی جھنجھلا کر اس کے خطوط کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ ایسے میں جب کبھی سونیا کے خط کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے تو وہ پریشان بھی ہوجاتے ہیں۔ انھیں سونیا کے نام پر ایک نہایت پرلطف مشغلہ ہاتھ آگیا ہے جس میں پرانی یادوں کو کریدنے کی لذت سے وہ ہمکنار ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے خطوں کے ذریعے سونیا کے دل میں ماں کے نام پر نفرت کو محبت میں تبدیل کردیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خطوں کے ذریعے سونیا کو اپنے اور سونیا کے رشتے اور سیاست سے خود کو الگ کرنے کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈرامے کے آخر میں ذوالفقار حیدر کی خواہش کے احترام میں سونیا ہندوستان آتی ہے لیکن یہاں وہ ان کی لاش سے ملتی ہے اور ابا کہہ کر لاش سے لپٹ جاتی ہے۔ ڈرامے کا اسکرپٹ نہایت مضبوط ہے اور اس میں زبان کی تازہ کاری کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن پیش کش میں بے شمار کوتاہیاں تھیں اس لیے اس کا جو تاثر قائم ہونا چاہیے تھا عوام پر وہ تاثر قائم نہ ہوسکا۔

بہر حال پروگرام کا اختتام ہوا اور اردو میلے کا ایک اور دن اختتام کو پہنچا۔ بارہ جنوری سے شروع ہوکر 16 جنوری تک کے مجموعی پروگرام پر اگر نظر ڈالیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان تمام ثقافتی سرگرمیوں کے درمیان اردو زبان اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور اس زبان کی یہ مقناطیسی خوبی ہی ہے جو اس دیارِ غیر میں بھی دیکھنے اور سننے والوں کو مسحور کررہی ہے۔ پروگرام کے اختتام پر ایک جم غفیر سونالی بیندرے اور فاروق شیخ سے آٹوگراف لینے اور ہاتھ ملانے کے لیے کوشاں ہے۔ بھیڑ حدِ اعتدال کو پار کرجائے اس کے پہلے ہی ان لوگوں کو منتظمین نے نہایت سرعت سے ہوٹل نلکشتر کی طرف روانہ کردیا جہاں وہ شب میں قیام کریں گے۔ رات کے گیارہ بجے تک لوگ کھانے سے فارغ ہوئے اور پھر اگلے دن کے پروگرام کا لائحہ عمل بناتے ہوئے اپنے اپنے مستقر پر چلے گئے۔

17 جنوری 2008 کی صبح ہم لوگ نے گوہاٹی سے ہوکر گزرنے والی ندی برہمپتر تک گئے۔ ایک بڑی ندی کے چوڑے پاٹ کے کنارے کھڑی ہوئی کشتیاں بہت دلچسپ نظارہ پیش کررہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی موٹر بوٹ بھی کنارے پر کھڑی نظر آئی جس پر سوار ہوکر لوگ ندی کے اس پار کاما کھیا مندر تک جاتے ہیں کُل ملا کر حسین قدرتی مناظر سے بھرا پُرا ندی کا کنارہ دیر تک رکنے کی دعوت دے رہا تھا لیکن نہ تو اس کا موقع تھا اور نہ ہی کوئی ایسا گروپ جو مجبور کرتا کہ تھوڑی دیر اور سبھی سارے لوگ کسی نہ کسی طرح کی ذمے داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے لشتم پشتم کلاکشیتر بھاگ آئے جہاں لوکیندر ترویدی اپنے ڈراما ''قیدِ حیات'' کی ریہرسل کررہے تھے۔

''قیدِ حیات'' سے پہلے مقامی آرٹسٹ حفیظہ بیگم اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے ''ذکر'' پیش کیا گیا۔ ذکر اپنے آپ میں ثقافتی ہم آہنگی کی ایک مثال ہے۔ ذکر آسامی زبان میں اس متصوفانہ کلام کو کہتے ہیں جو 17 ویں صدی میں سید شاہ میران بغدادی عرف حضرت اذان پیر صاحب بطور خاص احیائے

اسلام کے لیے آسام کی عوام کو گا گا کر سناتے تھے۔ یہ کلام نعتیہ بھی ہوتا ہے اور منقبتی بھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے بہت سارے بندوں میں کچھ بند خاص طور پر قومی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ اسٹیج پر ایک قطار میں پانچ عورتیں بیٹھ کر اسے گاتی ہیں۔ دوسری طرف 4 یا 5 مرد سازندے بانسری، مردنگ، یک تارہ اور ڈھول جیسے روایتی ساز سے آواز کو صیقل کرتے ہیں اور ان سب سے الگ ایک کرسی پر بیٹھی عورت ناظم وقفے وقفے سے اذان پیر صاحب کے احوال و کوائف، پر تاثیر انداز میں بیان کرتی جاتی ہے۔ اس کا طرز قوالی کا ہوتا ہے۔ عورتیں گانے کے دوران تالیوں کا استعمال کرتی ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے محفل سماع آراستہ ہو۔ عوام میں ذکر کے دوران عقیدت کا یہ عالم تھا کہ کوئی پہلو بدلنے کو تیار نہیں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک کا یہ پروگرام جب ختم ہوا تو ایسا لگا جیسے سارے لوگ کسی جن کے سحر سے یکا یک آزاد ہوگئے ہوں۔ میرے جیسے بہت سے لوگوں کے لیے ''ذکر'' پہلا تجربہ تھا لیکن نہایت خوشگوار تجربہ۔ آٹھ بج چکے تھے اور ابھی ''قید حیات'' پیش کیا جانا باقی تھا۔ یہ پروگرام بھی کلاکھیتر کے آڈیٹوریم میں ہو رہا تھا۔ تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ یکا یک انیس اعظمی صاحب اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور ''قید حیات'' کی تفصیل بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نیشنل اسکول آف ڈراما کی جانب سے سریندر ورما کا لکھا ہوا یہ ڈراما ''قید حیات'' لوکیندر ترویدی کی نگرانی میں پیش کیا جائے گا۔ غالب کی زندگی پر لکھے گئے تقریباً ایک درجن ڈراموں میں ''قید حیات'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔''

ڈراما شروع ہوا اور تقریباً 100 منٹ کا یہ ڈراما اپنی پیش کش اور افسانویت کے سبب بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا۔ ڈرامے میں غالب کی زندگی کے ان پہلوؤں کو افشا کیا گیا ہے جن پہلوؤں سے غالب کی شخصیت مجروح ہوتی ہے لیکن جس طرح غالب کی زندگی سے غربت، کسمپرسی، اور کرب کو منہا نہیں کیا جا سکتا اس ڈرامے میں بھی یہ ساری حقیقتیں ہیں۔ ڈومنی کے کردار سے ایک کاتب کے کردار کو بدل کر ایک افسانوی فضا قائم کی گئی ہے۔ سریندر ورما نے تخیل کے سہارے غالب کی زندگی میں پھیلے کرب کو بڑی خوبصورتی سے ان کی ازدواجی زندگی کی ناکامی سے جوڑ دیا ہے۔ ایک اہم بات یہ کہ اس ڈرامے میں زبان کی سطح پر غالب کے معاشرے کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس خالص ٹکسالی زبان کی ادائیگی نہایت مشکل ہے اور ڈراما دیکھنے پر اس کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ کچھ تحقیقی خامیاں بھی ہیں لیکن یہ سب بال کی کھال نکالنے والی باتیں ہیں۔ مجموعی طور پر ڈرامے میں حزن و یاس کا ماحول ہے لیکن زبان کی شیرینی اور محاوراتی مکالموں کی برجستگی سے ڈراما غیر معمولی ہو گیا ہے۔ ڈرامے کے اختتام پر ڈاکٹر علی جاوید صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہا بھی کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اردو زبان ہندوستان میں مشترکہ کلچر اور ساجھی برادری کی علامت ہے اور آج اس کا ثبوت آپ کے سامنے ہے۔ ابھی آپ نے غالب کی زندگی پر مبنی ڈراما ''قید حیات'' دیکھا اس ڈراما کو سریندر ورما نے لکھا ہے لوکیندر ترویدی اس کے ڈائرکٹر ہیں اور اس ڈراما کا ایک کردار بھی مسلمان نہیں۔ کیا اس کے باوجود بھی اردو زبان کو کسی مخصوص مذہب سے جوڑنا دیانت داری ہوگی۔

رات سرد ہوگئی تھی، تقریباً گیارہ بجنے والے تھے، شائقین کا غول بکھرنے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سوائے ڈرامے کے آرٹسٹ اور منتظمین کے سب جا چکے تھے۔ 17 جنوری 18 جنوری میں تبدیل ہوا چاہتا تھا۔ 18 جنوری، اختتامی تقریب، آسام کے وزیر تعلیم کے زیر صدارت انجام پذیر ہونے والا تھا۔ ایک خاص قسم کی مسرور تھکن تمام منتظمین پر حاوی ہو چکی تھی۔

18 جنوری 2008 ''اردو میلہ'' کا آخری دن تمام ہندوستان میں سورج نکلنے کے مقررہ وقت سے ذرا پہلے سورج یہاں عام طور پر نظر آ جاتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے آج اس نے بھی شب بیداری کی ہو کیونکہ آج اس کی آنکھیں سرخی مائل ہو رہی تھیں۔ موسم خنک تھا لیکن قابلِ برداشت، باہر سے آئے ہوئے تقریباً سارے آرٹسٹ سوائے این ایس ڈی گروپ کے جا چکے تھے۔

لفظ ''میلہ'' ہمارے معاشرے میں ایک ایسا ثقافتی لفظ ہے جو اپنے آپ میں جمہوریت اور سیکولرزم کا سمبل بن چکا ہے۔ اس لفظ کی اپنی ایک منفرد شناخت ہے بظاہر ''انبوہ'' اور ''ہجوم'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن جہاں ایک طرف صرف سیر و تماشے کے لیے جمع ہونے والی بھیڑ کو میلا کہتے ہیں وہیں کسی زیارت گاہ پر مقررہ تاریخوں میں لوگوں کے اجتماع کو بھی میلہ کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کا تعلق ہندوستان کی مٹی سے رہا ہے، اب وہ ہندوستان کا شمالی حصہ ہو یا جنوبی، مشرقی ہو یا مغربی جس طرح ہر جگہ ''میلہ'' اپنے مخصوص معنوں میں سمجھا جاتا ہے۔ اردو بھی ہر جگہ اپنے شیدائی رکھتی ہے اور اس کا ثبوت ہے گوہاٹی کا یہ ''اردو میلہ''۔ 12 جنوری سے 18 جنوری تک شمال مشرقی علاقے کے اس پہاڑ اور جنگل سے بھرے علاقے میں اردو نے کیسے اپنی جگہ بنائی معلوم نہیں۔ یہاں لوگوں نے اپنے دلوں میں اس زبان کے عشق کی کس طرح پرورش کی خدا جانے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں شیدائی اردو موجود ہیں، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اردو کے ان عاشقوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ جس زبان پر وہ عاشق ہیں وہ زبان اب ہندوستان پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیل چکی ہے۔

آخری دن کے اختتامی تقریب میں آسام کے وزیر تعلیم عالی جناب روہن بورا نے تقریر کے دوران اس بات کا اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد پہلی بار آسام میں اس بڑے پیمانے پر اردو کا کوئی جشن ہوا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر علی جاوید صاحب کا

شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ہندوستان کی تمام زبانوں کو ترقی کرنی چاہیے۔ مساوی ترقی چاہے انسان کی ہو یا زبان کی ملک کی سالمیت اور اس کے وقار میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وزیرِ تعلیم نے فرمایا کہ ہمارے وزیرِ اعلیٰ نے اسی جگہ سے گذشتہ 12 تاریخ کو قومی اردو کونسل کے ریجنل سنٹر کی ضرورت کے مطابق جس قطعۂ زمین کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے یقیناً وہ زمین دی جائے گی لیکن اگر علی جاوید صاحب فی الفور ریجنل سنٹر کا یہاں قیام چاہتے ہیں تو آسام کی حکومت عارضی طور پر فی الوقت مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی عمارت میں کمروں کا انتظام کرسکتی ہے۔ وزیرِ تعلیم نے اپنی تقریر کا اختتام کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں آپ کو جتنی مدد درکار ہے ہماری سرکار آپ کو دے گی۔ عوام نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے وزیرِ تعلیم کی یقین دہانی کا شکریہ ادا کیا۔ وزیرِ تعلیم کے بعد آسام ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہیر کمار نے بھی عوام سے خطاب کیا اور ڈائرکٹر قومی اردو کونسل سے گزارش کی کہ وہ جلد از جلد آسامی زبان کے ذریعے اردو سکھانے والی کتاب تیار کروائیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر علی جاوید نے اس پورے میلے کو کامیاب بنانے کا سہرا گوہاٹی کے عوام کے سر باندھتے ہوئے تمام حاضرین و غائبین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جس اردو زبان کو لوگ غیر ملکی زبان کہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ بٹوارے کے وقت نومولود ملک پاکستان کے پاس کوئی زبان نہیں تھی، ہم نے انھیں زبان عنایت کی۔ یہ زبان اپنی شیرینی اور صلح کل کی فطری خصوصیت کے سبب بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ اردو نے چہار دانگِ عالم میں ہندوستانی تہذیب کی اساس ''وسودھیو کٹمبکم'' کا پرچار کیا ہے۔ نفرت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں پیار کی شمع جلانے والی اس زبان نے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں اور جنگِ آزادی اس کی مثال ہے۔ ہم یہاں نہ صرف مختلف ثقافتی پروگرام لے کر آئے ہیں بلکہ مختلف علوم کی کتابیں بھی ساتھ لائے ہیں۔ ہندوستان گیر پیمانے پر 18 مشہور معروف پبلشرس اس کتاب میلے میں موجود ہیں۔ آپ نے ان کی کتابیں خریدی بھی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اب اردو میں زبان و ادب سے آگے بڑھ کر مختلف علوم وفنون پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے آخر میں تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میر کے اس شعر پر اپنی تقریر کا اختتام کیا کہ:

اب تو چلتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اب آخری دن کی تقریب کے پہلے حصے کا اختتامی خطبہ پیش کررہے ہیں اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد۔ پنڈال میں ایک جم غفیر موجود ہے۔ کتاب کی دکانوں پر بھی کافی بھیڑ دیکھی جارہی ہے۔ آج خریداری بھی ہورہی ہے اور لوگ بڑھ چڑھ کر اس تاریخی موقعے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

شمال مشرقی ہندوستان میں لوگ علاقائی زبانوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں لیکن اردو کی روشن و تابناک تاریخ سے وہ واقف ہیں اس لیے اردو زبان سے ان کی عقیدت والہانہ ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد اپنے مخصوص لہجے میں انکساری کا ریکارڈ توڑتے ہوئے گوہاٹی کی عوام، حکومتِ آسام کے عہدے داران وارکان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مرکزی وزیر حکومت ہند عالی جناب ارجن سنگھ جی، محترمہ ڈی پورن دیشوری کا بھی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مشرق ومغرب کا فرق مٹا کر جس طرح سارے ہندوستانی عوام کے دلوں کو جوڑنے کا کام کررہی ہے اس کی وجہ ڈاکٹر علی جاوید ہیں۔ ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پچھلے ایک سال میں مرکز سے ہٹ کر عام عوامی علاقوں میں اردو کی ترقی وترویج کے لیے وہ کوشاں ہیں۔ آج اگر آپ یہاں اس بات کا اعتراف کررہے ہیں کہ اس کے پہلے اس پورے شمال مغربی علاقے میں اردو کے نام پر اس طرح کا کوئی کام نہیں ہوا اور آج ہو رہا ہے تو اس شروعات کے لیے بھی علی جاوید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کا حوصلہ ان کو کامیاب کررہا ہے اور کامیاب ہورہی ہے ہماری اردو۔ اس کے پہلے امپھال اور اب گوہاٹی میں اردو کا یہ کامیاب پروگرام ثبوت ہے کہ اردو زبان کے شیدائی ہر جگہ ہیں، ضرورت ہے کہ انھیں قریب سے آواز دی جائے۔ دہلی میں بیٹھ کر آسام، کیرل یا گجرات تک آواز نہیں پہنچ سکتی۔ ہم قریب آئے اور ہماری آواز پر لبیک کہنے والے یہاں موجود ہیں۔ تقریر کے آخری حصے میں ڈاکٹر ابوبکر عباد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دہلی مرکز سے گوہاٹی آئے تمام کارکنان کا نام بہ نام شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کی محنت ولگن سے یہ پروگرام اس درجہ کامیاب ہوا۔ یہ تقریری سلسلہ ختم ہوا۔ اب اسٹیج پر ٹی بی گرلز اسکول کی بچیوں نے زرق برق لباس میں صف بندی کرلی ہے، سارے لوگ کھڑے ہوگئے اور قومی ترانہ پیش کیا گیا۔ ایک پروقار خاموشی اور اس خاموشی میں روشنی کی کرنوں کی طرح پھوٹتی ہوئی مترنم آواز...

سجلام سپھلام ملیجہ شیتلام
شسیہ شیاملام ماترم
وندے............ ماترم
وندے............ ماترم

□□□

H.No-1/135-136,
C.P.J. Block New Silampur,
Delhi-110053

مہیپ سنگھ

کتنا عجیب

ہم دونوں اس فلیٹ سے نیچے اتر کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں میں کوئی کچھ نہیں بولا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم دونوں ہی تذبذب میں ہیں۔ چلتے ہوئے دیو نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جانی پہچانی شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری، ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے،'' میں نے کہا۔

اب ہم دونوں بس اسٹاپ پر آگئے تھے اور اس جانب دیکھ رہے تھے، جدھر سے بس کو آنا تھا۔

دیو بولا، ''تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

''فیصلہ کر پانا بہت مشکل ہو رہا ہے''، میں نے کہا، ''دیو، کیا یہ عجیب نہیں ہے کہ اب کسی بھی بات کا دوٹوک فیصلہ کرسکنا آسان نہیں رہا''

پرمانند جی نے کچھ دن پہلے مجھ سے کچھ روپے ادھار مانگے تھے — زیادہ نہیں صرف چار سو۔ انھوں نے مجھے صبح صبح فون کیا تھا اور کہا تھا کہ کسی ضروری کام سے وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دوسرے دن شام کو ہم کناٹ پلیس کے ایک کافی ہاؤس میں ملے۔ میں انھیں تین چار سال بعد مل رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی بس دو ایک بار سرسری ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، یہ احساس ہمیشہ باقی رہا۔

اس دن انھیں دیکھ کر دھچکا سا لگا۔ وہ کافی ہاؤس میں بہت دھیرے دھیرے، چھڑی کا سہارا لیے اور کچھ لنگڑاتے ہوئے داخل ہوئے تھے۔ یکبارگی ایسا لگا تھا جیسے واقعی وہ بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔

کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ بولے، ''راج بھائی، آپ سے کہتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ مجھے اچانک کچھ روپے کی ضرورت آن پڑی ہے۔ آپ کو حیرانی تو ہو رہی ہوگی کہ یہ بات میں اپنے کسی عزیز، رشتے دار سے نہ کہہ کر آپ سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ آپ سے بہت کم بار ملنا ہوا ہے لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے کہ آپ سے بہت قربت محسوس کرتا ہوں۔''

مجھے واقعی اس کا گمان نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ضرور کسی معاشی مشکلات سے دوچار ہیں۔ میں ان کے خاندانی حالات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے سوچا— شاید پرمانند جی کی کوئی اولاد نہ ہو اور اب بڑھاپے کے دن مشکلات میں گزر رہے ہوں — یا ان کی اولاد ان کی پروا نہ کرتی ہو... لڑکے کہیں اور رہتے ہوں... لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہو۔ پھر میرا دھیان پینٹ کی پچھلی جیب میں پڑے پرس کی طرف گیا تھا۔ اس میں پچیس تیس روپے ہونے کا اندازہ تھا۔ میں ان کے سامنے اپنی معذوری ظاہر کرنے میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

بولا، ''پرمانند جی! اس وقت تو میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ آپ مجھے دو چار دن کا موقع دیجیے تو میں کچھ کوشش کروں۔''

وہ بولے، ''کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو دو تین دن بعد فون کرلوں گا۔''

پھر ان کے متواتر کئی فون آئے۔ کئی بار میں گھر پر نہیں ملا۔ مجھے ان کا پیغام ملتا رہا لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ میں ان کے لیے روپے کا انتظام نہیں کر پا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے نرمل جی کا دھیان آیا۔ وہ میرے پرانے دوست ہیں اور معاشی طور پر خوشحال ہیں۔ انھوں نے مجھے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اگر میں کسی کو مناسب اور سچا ضرورت مند سمجھوں تو وہ اس کی مالی مدد کر دیتے ہیں۔ اس سے مجھے کچھ راحت ملی۔ میں نے سوچا، نرمل جی سے کہہ کر پرمانند جی کو چار سو روپے دلوا دیتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ اگر پرمانند واقعی مالی دشواریوں میں ہیں تو ان روپیوں سے ان کی وقتی ضرورت ہی پوری ہوسکتی ہے۔ کیوں نہ ان کے لیے کچھ مستقل ڈھنگ کا انتظام کیا جائے۔ ان کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے میں اور دیو اس دوپہر کو ان کے گھر جا پہنچے۔

ہمارے کال بیل کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا، وہ چالیس سال کے آس پاس کا رہا ہوگا۔

میں نے کہا، ''ہم پرمانند جی سے ملنا چاہتے ہیں۔''

اس شخص نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا، ''پتا جی دوسرے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ میں بلاتا ہوں۔''

چھوٹے سے ڈرائنگ روم کا فرنیچر پرانا ضرور تھا لیکن کافی پختہ تھا۔ ایک الماری میں کتابیں سجی تھیں اور دوسری میں کھلونے، کپ، فریم کی ہوئی تصویریں وغیرہ۔ ایک کونے میں ٹیلی ویژن رکھا تھا اور فرش پر پرانا غلیچہ بچھا ہوا تھا۔

پرمانند جی آکر سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ آج وہ مجھے اتنے بوڑھے اور تھکے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے۔ بے وقت آکر انھیں تکلیف دینے کے لیے میں نے ان سے معافی مانگی اور دیو کا تعارف کرایا۔

ان کا بیٹا باہر گیلری میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا۔ پرمانند جی نے بتایا کہ وہ ڈفنس منسٹری میں کام کرتا ہے۔

ہم لوگ کچھ دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ پرمانند جی سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہمارے ملک کی سیاست اور قومی زندگی میں تیزی سے ہوتا اخلاقی زوال ایسے موضوعات ہیں جس پر کہیں بھی کتنی ہی دیر بات چیت کی جاسکتی ہے۔ لیکن میں اپنے اندر شرمندگی اور تذبذب محسوس کر رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ دیو کو مجھے اپنے ساتھ نہیں لانا چاہیے تھا۔ پرمانند جی کسی تیسرے شخص کے سامنے اپنی بات کہنے میں ضرور جھجک محسوس کریں گے۔

لیکن ایسی نوبت نہیں آئی۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد انھوں نے خود ہی استفسار کیا،'' راج جی، آپ نے میرا کام کیا کہ نہیں؟''

میں نے کہا،'' پرمانند جی، ابھی تو آپ کا کام نہیں ہوا، لیکن امید ہے جلد ہی ہو جائے گا۔''

دوسرے کمرے سے فون کی گھنٹی سنائی دی اور پرمانند جی اٹھ کر ادھر چلے گئے۔

دیو آہستہ سے بولا،'' یہ تو اچھے کھاتے پیتے لوگ لگتے ہیں بیٹا سرکاری نوکری میں ہے۔ گھر میں ساری جدید سہولیات ہیں۔''

میں نے کہا،'' ہمارا متوسط طبقہ تو ایسا ہی ہے۔ اوپر سے بھرا پورا اور اندر سے کھوکھلا۔''

دیو نے کہا،'' لیکن اس کیس میں کیا تم نرمل جی سے مدد کروانا مناسب سمجھتے ہو؟''

میں کچھ کہتا کہ پرمانند جی آگئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے،'' راج بھائی، میرا کام جتنی جلد ہو سکے کرا دیجیے۔''

'' میں پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

بس اسٹاپ پر ہمیں آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بس ملی۔ آدھے گھنٹے تک دیو اور میرے درمیان پرمانند جی مسلسل موجود رہے۔ دیو کہہ رہا تھا،'' تم کہتے ہو، ان سے تمھاری صرف دو تین بار کی ملاقات ہے۔ روپے ادھار مانگنے کے لیے تعلقات کی اتنی پتلی اور کچی دیوار پر کوئی نہیں چڑھتا۔''

میں سوچ رہا تھا— پرمانند جی کی ضرورت بھی بہت ضروری نہیں لگتی۔ جب انھوں نے روپے مانگے تھے، اس دن سے لے کر آج تک پندرہ بیس دن گذر ہی چکے ہیں۔

بس میں بے پناہ بھیڑ تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کتنوں کے کندھے ہم سے رگڑ کھا رہے تھے۔ حبس اور پسینے کی چپ چپاہٹ میں کلبلاتے ہوئے جسموں کا جنسی امتیاز بھی جیسے ختم ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سبھی فقط جسم ہیں۔ مٹ میلے چمڑی سے ڈھکے ہوئے بے لباس جسم۔

ہم بس سے اترے تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہم بس اسٹاپ کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں بھی بھیڑ، پسینے، حبس کا وہی حال تھا۔ جسموں سے نکل کر جو بو ہمارے چاروں طرف پھیل رہی تھی وہ میرے اپنے جسم کی بو لگ رہی تھی۔ کچھ بوچھاریں ڈال کر اور ہمارے پسینے کی نمی کو اور بڑھا کر برسات چلی گئی۔ ہم دونوں پیدل چلنے لگے۔

'' تمھیں یہ سب عجیب نہیں لگتا؟''

دیو نے میری جانب دیکھ کر یہ سوال کیا تھا اور اب وہ سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔

میں نے کہا،'' ہاں، لگتا ہے۔ اپنی چاروں طرف جم غفیر دیکھ کر بہت عجیب لگتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس زمین پر ایک انچ بھی ایسی زمین ڈھونڈنا مشکل ہوگا جہاں انسان نہ ہو۔ چاروں طرف کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلاتے ہوئے انسان ہوں گے۔ سب ایک دوسرے سے ادبے ہوئے، کھسیائے ہوئے اور پریشان دکھیں گے۔ ساری جمالیات حبس اور پسینے میں تحلیل ہو کر نالیوں میں گرتی نظر آئے گی۔''

'' آج تم کافی جھلائے ہوئے لگ رہے ہو۔'' دیو بولا،'' اس جھلاہٹ کی وجہ گرمی ہے یا پرمانند جی؟''

'' دونوں ہی۔''

چلتے ہوئے ہم دونوں ایک مشہور آرٹ گیلری کے پاس آگئے تھے۔ ہم لوگ کہاں جا رہے تھے، یہ بھی ہمیں معلوم نہیں تھا۔ صرف اتنا طے تھا کہ کہیں بیٹھ کر ہم لوگ ایک ایک پیالی اچھی چائے کی پئیں گے۔

دیو ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ بولا،'' اس گیلری میں کوئی نہ کوئی نمائش ضرور چل رہی ہوگی۔''

'' چل تو رہی ہوگی، لیکن اس وقت نمائش دیکھنے کا موڈ نہیں۔''

'' گولی مارو موڈ کو۔'' دیو ایک سمجھدار شخص کی طرح بولا،'' آرٹ گیلری ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اگر ہم لوگ آدھا۔ ایک گھنٹہ ایئر کنڈیشنڈ ہال میں گزار لیں تو جسم سے چپکے ہوئے بے حساب بچھوؤں سے کچھ تو راحت ملے گی۔''

مجھے اس کا مشورہ ٹھیک لگا۔

ہال میں داخل ہوتے ہی ایئر کنڈیشننگ کی بھینی بھینی خوشبو اور ہلکی سرسراتی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ داہنی طرف ایک میز پر نمائش میں لگائی گئی پینٹنگس کے کیٹلاگ رکھے ہوئے تھے۔ کیٹلاگ کی ایک کاپی اٹھاتے ہوئے نظر میز کے پیچھے بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ وہ استقبالیہ انداز سے مسکرائی۔ اب یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ نمائش میں لگی پینٹنگس اسی کی ہیں۔

دیو نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ آرٹ کریٹک ہے اور لکھنؤ کے سب سے زیادہ سرکولیشن والے روزنامے کے لیے دہلی کی ثقافتی سرگرمیوں پر مستقل طور سے کالم لکھتا ہے۔ وہ لڑکی کھڑی ہو گئی۔ اب اس کی مسکراہٹ میں ہمارے لیے (دیو کے لیے زیادہ میرے لیے کم) شیرینی اور بڑھ گئی تھی۔ دیو نے اسے اپنے ساتھ لے لیا اور ہر پینٹنگ کے سامنے کھڑا ہو کر اس پینٹنگ کے موضوع اور کلر کمبی نیشن کے بارے میں اس سے بات کرنے لگا۔

میں نے پانچ سات منٹ میں اپنا راؤنڈ پورا کر لیا۔ سبھی پینٹنگس میں مجھے ایک جیسی موٹی موٹی، بھدی اور مسخ شدہ شکلیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن دیو ایک ایک پینٹنگ کے بارے میں گہری دلچسپی دکھاتے ہوئے آرٹسٹ لڑکی سے گفتگو کر رہا تھا اور اس قدر سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہاں سے باہر نکلتے

ہی وہ اس نمائش پر اپنا تبصرہ لکھنے بیٹھ جائے گا۔

وہ اپنا راؤنڈ پورا کر کے مڑا اور پھر کافی دیر تک اس لڑکی سے بات چیت کرتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا، دیو بھی بس عجیب ہے۔ بات چاہے دسترخوان کی ہو یا خارجہ پالیسی کی، ہر جگہ اس کا دخل ہے۔ وہ زندگی کو ہوا کی سطح پر جی لیتا ہے۔ باغیچے سے نکلے تو پھولوں کی خوشبو لے لی، کوڑے کے ڈھیر کی جانب مڑے تو وہیں رک گئے۔ بغیر رنگ والے شخص کا رنگ بھی کس قدر عجیب ہوتا ہے، جس ترنگ میں پہنچے اسی میں خود کو بے تامل سے رنگ جانے دیا۔

تبھی مجھے اپنی کمر پر ایک ملائم بانہہ کی گرفت کا احساس ہوا اور پیچھے سے ایک بھولی بسری نسائی مہک میری ناک میں اترتی چلی گئی۔

وہ بینا تھی۔

''تمھیں پینٹنگس دیکھنے کا شوق کب سے پیدا ہوا؟'' پھر اس نے اس آرٹسٹ لڑکی کی طرف دیکھا جو اس وقت تین چار لوگوں کے درمیان تھی۔ ''میں سمجھ گئی، تم آرٹ سے زیادہ آرٹسٹ کو دیکھنے آئے ہو۔''

دیو اس لڑکی سے فرصت پا کر ٹھہری ہوئی ہوا کی طرح ہو گیا تھا۔ مجھے کسی خاتون سے بات کرتا دیکھ وہ ادھر ہی کھنچا چلا آیا۔

''بینا، تم دیو سے مل چکی ہو نا۔'' میں نے تعارف کرانے کے انداز میں کہا۔

اس نے اپنا ہاتھ دیو کی جانب بڑھا دیا اور بولی، ''تمھارے ساتھ ہی ان سے پہلے بھی ملی ہوں۔''

میں نے دیو سے پوچھا، ''تمھارا آرٹ تبصرے کا کام پورا ہوا یا نہیں؟''

وہ مسکرایا اور پھر اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن وہ لڑکی اس وقت کتنے ہی لوگوں میں گھری ہوئی تھی۔

''آپ آرٹ کریٹک ہیں کیا؟'' بینا نے اشتیاق سے پوچھا۔ میں اتنی زور سے ہنسا کہ بہت سارے لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ میں کہا، ''دیو صاحب، آرٹ کریٹک نہیں، ہارٹ کریٹک ہیں۔ یہ ہر چیز کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔''

آرٹ گیلری سے باہر آگئے تو پھر اسی حبس سے سامنا ہوا جسے ہم ایئرکنڈیشنڈ ہال کی وجہ سے کچھ دیر تک بھولے ہوئے تھے۔

بینا میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ بولی، ''آج کل تم رہتے کہاں ہو؟ تمھاری شکل دیکھے مدت گزر جاتی ہے۔''

''ہم کہاں رہیں گے میڈم!'' میں نے خالص رومانی انداز سے کہا، ''آپ نے تو ہمیں آنکھوں سے گرے آنسو کی طرح بھلا دیا۔ مانا کہ آپ بہت بڑی ہستی ہو گئی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ پرانے دوستوں کو بھلا دیا جائے۔''

اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا، ''چلو، آج میرے ساتھ گھر چلو۔ کافی دن سے تمھارے ساتھ بیٹھ کر باتیں نہیں ہوئیں۔'' پھر اس نے دیو کی طرف دیکھا، ''دیو صاحب، آپ بھی چلیے آج ہمارے غریب خانے پر۔''

ویسے میں اب کہیں جانے کے موڈ میں نہیں تھا اور شاید دیو بھی واپس گھر جانا چاہتا تھا لیکن بینا کی تجویز کچھ اس طرح ہمارے درمیان معلق تھی کہ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک ہی نہ سکے۔ بینا کی ایک بانہہ میری بانہہ میں پھنسی ہوئی تھی۔ دوسرے سے اس نے دیو کی بانہہ تھام لی اور سڑک پر کھڑی اپنی کار تک گھسیٹتی لے آئی۔

کار کو وہ نئی دہلی کی سڑکوں پر دوڑاتی لیے جا رہی تھی۔ میں آگے اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور دیو پچھلی سیٹ پر ٹھیک میرے پیچھے۔ ایک موڑ پر جب اس نے اپنی کار کو بڑی تیزی سے داہنی جانب موڑا تو میں اس پر گرتے گرتے بچا۔ اس نے اسٹیرنگ سے ایک ہاتھ چھوڑ کر میرے کندھے کو تھپتھپایا اور تھوڑا پیچھے دیکھ کر بولی، ''دیو، تمھیں معلوم ہے، تمھارا یہ دوست ایک زمانے میں مجھ سے عشق کرتا تھا۔''

''یہ اتنا نکما کیوں ہے؟ اس کی وجہ مجھے آج معلوم ہوئی۔'' دیو نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

میں نے کہا، ''دیو، بینا کہتی تو ٹھیک ہے لیکن صرف میرے عشق کرنے سے کیا ہونا تھا! اس نے تو مجھے کبھی گھاس نہیں ڈالی۔''

''جھوٹ!'' بینا یکبارگی چیخ اٹھی، ''تم گھاس کو روتے ہو میں نے تمھارے سامنے پکوانوں سے سجا تھال رکھا تھا۔ لیکن... اب میں تمھارے جیسے آدمی کے لیے کیا کہوں جو سامنے کی تھال کو ٹھکرا کر گھاس کے پیچھے بھاگتا ہے۔''

''بس، یہی برائی ہے اس آدمی میں۔'' دیو بولا، ''اپنی کاٹی ہوئی گھاس کے سامنے دوسرے کی تھالی کو یہ کچھ نہیں سمجھتا۔''

دیو کی بات کا بینا کچھ جواب دیتی، اس سے پہلے ہی اس کی کار کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ ہم لوگ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ چوکیدار نے فوراً گیٹ کھولا اور بینا اپنی گاڑی اندر لے آئی۔

بینا آج مجھے ایک لمبے عرصے کے بعد ملی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ لاجپت نگر کے ڈبل اسٹوری والے مکان میں ہی رہتی ہوگی۔ لیکن اس وقت ہم گرین پارک کے ایک نئے اور بالکل جدید ڈھنگ کے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کے فلیٹ میں پہنچ کر میں کچھ چکرایا ضرور۔ بینا کی معاشی حالت بدل گئی ہے، یہ تو مجھے پتہ تھا، لیکن اتنی بدل گئی ہے، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

بینا نے نوکر کو آواز دے کر ہمارے لیے چائے بنانے کو کہا اور ساتھ ہی کچھ پکوڑے وغیرہ بھی بنانے کو کہہ دیا۔ اتنے میں مما مما... کہتا ہوا ایک نوخیز جو ہمارے سامنے نمودار ہوا، اسے دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بینا کا بیٹا تھا۔ میں اسے کئی برس بعد دیکھ رہا تھا۔ بینا کے پرانے مکان میں میں نے اسے کتنی بار بازار لے جا کر آئس کریم کھلائی تھی۔ آج اس نے میری جانب بالکل توجہ نہیں دی۔ پتہ نہیں، اس لیے کہ اپنی عمر کے اس عرصے میں جب اس کی یادیں نئے واقف کاروں کی رم جھم برسات کو مسلسل سمیٹتی جا رہی تھیں، میری یاد پوری طرح دھل پونچھ چکی تھی یا مجھے غیر ضروری سمجھ کر اس نے مجھے نظرانداز کیا تھا۔

بے ترتیب بڑھے لمبے بالوں، تھوڑی تھوڑی بھیگی مسیں، بدرنگ جینس اور اس میں دبی بغیر بٹن کی ٹی شرٹ میں وہ پوری طرح ہپّی لگ رہا تھا۔

''ممّا... میں ریتو کو بس اسٹاپ تک چھوڑنے جارہا ہوں۔''

بینا کے چہرے پر ہلکی سی الجھن دکھائی دی۔''ریتو؟ ریتو کہاں ہے؟''

اتنے میں ہمارے سامنے ایک اور چہرہ نمودار ہوا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک دُبلی پتلی لڑکی، تراشے مٹ میلے بال، مرجھایا اور تھکا سا چہرہ، وہی گندی اور مٹ میلی جینس، لوز سا ٹاپ۔

''ہیلو آنٹی...''

''لگتا ہے، آج تم دونوں بہت دیر تک ناچے ہو؟'' بینا بولی۔

''یس آنٹی... کمپٹیشن کی تیاری کرنی ہے نا'' وہ بولی۔ پھر وہ دونوں چلے گئے۔

ہم لوگوں نے چائے پی، پکوڑے کھائے، بے سر پیر کی بہت ساری گپ شپ کی اور پھر وہاں سے چل دیے۔ بس میں تو ہمیں کچھ دیر تک بیٹھنے کو سیٹ ہی نہیں ملی، پھر ملی بھی تو الگ الگ۔ مجھے لگا، دیو مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔

کچھ دیر بعد اس کے ساتھ کی سیٹ خالی ہوگئی۔ وہ اس پر ایک سیاستداں کی طرح قابض ہوگیا اور میرا نام لے کر زور سے چیخا

میں اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔

''سنو، یہ تمھاری بینا کام کیا کرتی ہے؟''

''پتی کی موت تک یہ کسی دفتر میں کام کرتی تھی، اب کیا کرتی ہے، مجھے بالکل پتہ نہیں۔''

''جس ڈھنگ سے جیتی ہے، اس سے تو اس کی آمدنی ہزاروں میں ہونی چاہیے۔''

''ہونی تو چاہیے...''

''تمھیں یہ سب عجیب نہیں لگتا؟''

''ہاں، لگتا ہے،'' میں نے بولنا شروع کیا،'' دہلی کی ٹریفک کے مسئلے کو سوچ کر بہت عجیب لگتا ہے۔ شہر کی آبادی تل چٹوں کی بھیڑ کی طرح بڑھتی جارہی ہے۔ سرکار سڑکوں کو چوڑا کرتی ہوئی لوگوں کے دروازوں تک لے آئی ہے۔ ابھی تک سواریوں کی آواز ہم کانوں سے سنتے رہے ہیں۔ لگتا ہے، اب انھیں ناک سے سونگھا بھی جاسکے گا۔''

دیو باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

اپنے اسٹاپ پر ہم دونوں بس سے اتر کر چل دیے۔ دن میں ہم کتنے ہی پیالے چائے کے کیوں نہ پئیں اپنے اپنے گھروں کی جانب مڑنے سے قبل ہم لوگ ''دیودار'' میں بیٹھ کر ایک ایک پیالہ چائے ضرور پیتے ہیں۔

چائے نکلتی بھاپ میں آنکھیں گڑائے دیو بولا،''یار، پرمانند جی تو مجھے بہت عجیب لگے۔ کماؤ بیٹا، اچھا خاصا گھر، ساری طرح کی سہولیات، اور بس تھوڑی سی جان پہچان میں وہ تم سے چار سو روپئے مانگ بیٹھے اور عجیب بات یہ کہ پندرہ بیس دنوں سے ان روپیوں کے ملنے کا انتظار بھی کر رہے ہیں۔''

میں اپنے پیالے میں چمچہ ہلاتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔

''دیو، وہ آرٹسٹ لڑکی بھی عجیب تھی۔ سبھی تصویروں میں اس نے عجیب گول مٹول سی ننگی مسخ شدہ شکلیں ابھار دی تھیں جب کہ خود کتنی کسن اور نکھری نظر آرہی تھی۔''

اب دیو کی باری تھی۔ وہ بولا،''یہ بھی کتنا عجیب ہے کہ اس ملک کی ساری سیاست کتنی غیر اصولی ہوتی جارہی ہے۔ ابھی تک فرد پارٹی بدلتے رہے ہیں، اب پوری پارٹی کی پارٹی بدل جاتی ہے۔ کسی دن سارے ملک نے ہی پارٹی بدلنے کا فیصلہ کرلیا تو کیا ہوگا؟''

ہم دونوں رفتہ رفتہ چائے سپ کرتے رہے اور ''دیودار'' کی ہلکی روشنی میں دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں کی شکلوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے رہے۔

''بینا کے بیٹے کو تم نے دیکھا؟'' دیو بولا،'' کیسا عجیب وغریب مخلوق لگ رہا تھا اور اس کے ساتھ کی چھچھندری جس کے ساتھ وہ ہم لوگوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے گھنٹوں ڈانس کرتا رہا تھا۔ ہمارے بڑے شہروں میں جو یہ نئی نسل ابھر رہی ہے، تمھیں عجیب نہیں لگتا؟''

میں خاموش چائے پیتا رہا۔

کچھ دیر بعد دیو ہی بولا،''اور تم بھی تو کچھ کم عجیب نہیں ہو۔'' اس کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ ابھری،''تمھارے نام کو رونے والی ایک بینا ہی تو نہیں ہے۔''

میں ہنس دیا۔ چائے کی آخری گھونٹ لی اور پیالی پلیٹ میں رکھ دی۔

ویٹر کے پلیٹ میں دس روپئے کا نوٹ رکھ کر میں نے سونف کے پانچ سات دانے منہ میں ڈال لیے۔ میں نے کہا،''دیو، سنسکرت والوں کے لیے تم دیوتا ہو۔ لیکن تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ فارسی والوں کے لیے کیا ہو؟''

''میرا نام بھی کتنا عجیب ہے۔'' وہ بولا،''سنسکرت اور سنسکرت سے متاثرہ زبانوں کے لیے میں جنت میں سیر کرنے والا، ماورائی طاقتوں سے پُر، لازوال، عظیم جسم والا دیوتا، پرماتما ہوں۔ اور فارسی اردو والوں کے لیے راکشش، خبیث اور بھیانک ڈیل ڈول والا پشاچ ہوں۔''

ہم دونو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''دیودار'' میں بیٹھے سبھی لوگ ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگے۔...'' کیسے عجیب لوگ ہیں!!''

□□□

پتہ:
مترجم: خورشید عالم
F-60, Sector 40, NOIDA-201301

سید اقبال امروہوی

ژین پیاژے

قدیم اور جدید دور کے ماہرین نفسیات کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے آخر میں دو نام ایسے آتے ہیں جن کو ہم صحیح معنوں میں قدیم اور جدید دور کی ایک کڑی مان سکتے ہیں۔ تاریخ وفات کے لحاظ سے اس فہرست میں آخری نام اسکینر کا ہے اور اس سے پہلے ژین پیاژے کا جو تقریباً 26 سال پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوا ہے اور جس کی اہمیت نہ صرف نفسیات میں بلکہ دوسرے علوم میں بھی تسلیم کی جاتی ہے اور جو اپنے زمانے کا ایک قابل قدر دانشور مانا جاتا ہے۔ پیاژے کا نام کسی ایک علاقے تک ہی محدود نہیں اور نہ ہی اس کی خدمات کسی ایک شعبے کے لیے مخصوص تھیں بلکہ اس نے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں اور دنیا کے ہر خطے میں اس کے نظریات سے استفادہ کیا گیا۔ آج بھی جب ''وقوفی نفسیات'' کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں پیاژے کا نام آجاتا ہے۔ شخصیت پر اگر بات چلی ہو تو پیاژے کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ مختصر طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پیاژے پیدائشی طور پر غیر معمولی ذہین بلکہ فطین تھا جس نے دس سال کی عمر میں ایسا مضمون لکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام پورے سوئزرلینڈ کے اسکولوں میں مشہور ہو گیا تھا اور اس مضمون سے ابتدا کرنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور تک وہ تقریباً ساٹھ کتابوں کا مصنف تھا جس میں ایک کتاب 37 جلدوں پر مشتمل تھی، اور پانچ سو سے زیادہ مقالات دنیا بھر کے جرائد میں لکھ چکا تھا۔

ژین پیاژے کی علمی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی 31 یونیورسٹیوں نے اس کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں عطا کیں جن میں ہارورڈ، مانچسٹر اور کیمبرج یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ اس نے عالمی پیمانے پر یونیسکو کے کئی اداروں کے ڈائرکٹر اور معاون ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کو 1972 میں عالمی شہرت یافتہ Erasmus Prize سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی گیارہ ایسے انعامات دیے گئے جن کی علمی دنیا میں عالمی سطح پر اہمیت ہے۔

ژین پیاژے 9 اگست 1896 کو سوئزرلینڈ میں Neuchtel کے مقام پر ایک پروفیسر کے گھر پیدا ہوا اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ذہانت کا اعلیٰ معیار اور علمیات سے گہری دلچسپی اس کو وراثت میں ملی تھی۔ اپنے شہر کے مقامی کالج سے گریجویشن مکمل کیا۔ اس نے اپنا پہلا مضمون ایک پرندہ پر لکھا تھا اور اس کے بعد اس کی دلچسپی اس موضوع سے بڑھتی ہی گئی اور اس نے فطرت کے مشاہدے پر زیادہ توجہ دینا شروع کی۔ اسی اسکول کے Natural History Museum میں ڈائرکٹر کے معاون کی حیثیت سے جز وقتی ملازمت مل گئی اور اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس دوران اس نے فطرت سے متعلق کئی مضامین لکھے جو پورے یوروپ میں شوق سے پڑھے جاتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا مصنف ایک نوعمر جوان ہے۔ فطری سائنس سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور اسی مضمون میں اس نے ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر 1918 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے سائنس سے توجہ ہٹا کر فلسفہ کی جانب موڑ دی تھی اور فلسفہ کے مطالعے کے دوران اس کو نفسیات کے مطالعے سے بھی واسطہ پڑا۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اس نے ایک سال تک Zurich میں ڈاکٹر بلیولر کی مشہور زمانہ نفسیاتی لیباریٹری میں ایک سال گزارا اس دوران وہ سگمنڈ فرائڈ سے بھی متعارف ہوا اور اس کے بعد اس نے تحلیل نفسی میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے نفسیات کو اپنا موضوع بنا لیا۔ اسی سلسلے میں وہ پیرس چلا گیا جہاں وہ ایک کالج میں نفسیات کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ اسی کالج میں اس کو سائمن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک سائمن کی ذہانت کی آزمائش کے چرچے عام ہو چکے تھے اور اس پر تحقیقی کام ہو رہا تھا۔ پیاژے نے بھی اس سلسلے میں تحقیق کا کام شروع کیا لیکن اس نے سائمن کے طریقۂ کار پر عمل کرنے کے بجائے صحیح یا غلط کا خیال کیے بغیر اپنا الگ طریقہ استعمال کیا۔ وہ بچوں سے سوالات کرتا تھا اور بحث و مباحثے کی شکل میں بچوں کے اندر پوشیدہ ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اسی طریقۂ کار کی وجہ سے اس نے وقوفی نشوونما کا ایک نظریہ پیش کیا جس کے ذریعے وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان میں وقوفیت کا ارتقا کس طرح ہوتا ہے اور معلومات حاصل کرنے میں کس طرح اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ اس کو اس نے Congnitive Psychology کا نام دیا۔ اسکول کے بچوں سے بحث و مباحثے کے ذریعے ان کی ذہانت اور وقوفی صلاحیت کا اندازہ لگانے کا طریقہ اس وقت بالکل جدید مانا جاتا تھا اس لیے ابتدا میں اس کو اس میں زیادہ لوگوں کا تعاون نہیں مل سکا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور اس شعبے میں مسلسل کام کرتا رہا۔

ژین پیاژے کے تین بچے ہوئے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا، پیاژے نے اپنی بیوی کے تعاون سے ایک منصوبے کے تحت اپنے بچوں کی نشوونما کا باریکی سے مشاہدہ کیا اور اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا۔ اس سلسلے میں اس کو جو معلومات حاصل ہوئیں اور تجربات کے جو نتائج اخذ کیے گئے ان پر مشتمل مواد تین کتابوں

میں شائع کیا تھا "نفسیات نمو" میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بچوں کی نفسیات میں ایک سلسلے کا آغاز کیا جو بعد میں جا کر "نفسیات نمو" کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ پیاژے نے اپنے تجربات سے یہ بات واضح کی کہ کس طرح بچوں میں وقوفی صلاحیت نشوونما پاتی ہے اور کس طرح چھوٹی عمر میں سمجھ داری اور استدلال کی صلاحیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

نفسیات میں پیاژے کی بچوں میں "حسی حرکی منازل" کے بارے میں تھیوری بہت مشہور ہے۔ ساتھ ہی اس نے "وقوفی نشوونما" سے متعلق جو نظریہ پیش کیا اس نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی اور اس پر مزید تجربات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نے اس کو Genetic Epistemology کا نام دیا۔ (Epistemology کے لیے اردو میں "علمیات" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور یہ فطرت کے مطالعے کے ذریعے علم حاصل کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے)۔ پیاژے کا خیال تھا کہ یہ علم حاصل کرنے کا عمل نشائی مرحلہ سے ہی شروع کرنا چاہیے کیونکہ ان معلومات کو حاصل کرنے کا عمل دراصل ایک مصالحتی عمل ہے اور یہ دو انفعال تھا کہ یہ علم حاصل کرنے کا عمل نشائی مرحلہ سے ہی شروع کرنا چاہیے کیونکہ ان معلومات کو حاصل کرنے کا عمل دراصل ایک مصالحتی عمل ہے اور یہ دو انفعال کے باہم ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ ان دو انفعال یعنی Assimitation (یعنی جذب کرنا یا اپنانا) اور Accomodation (یعنی عمل تطبیق جس کا مفہوم مصالحت کرنا بھی لیا جاتا ہے) میں پہلی اصطلاح اس نے اس عمل کے لیے استعمال کی ہے۔ جب بچہ اپنے ماحول سے ہر نئی چیز کا مطلب اپنے انداز میں لیتا ہے اور اس کا یہ انداز اس کے اپنے تجربے پر منحصر ہوتا ہے، اسی طرح دوسری اصطلاح سے اس کا مطلب تھا کہ بچہ اپنے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنی سوچ کے انداز کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ مختلف اشیا کی معلومات حاصل کرتا ہے۔ ایک اور اہم بات جو اس نے کہی کہ ان دونوں اعمال کے ساتھ ساتھ اس کو توازن برقرار رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بچہ خود بخود ان دونوں مراحل میں ایک توازن قائم کرلیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ اپنے پرانے تجربات کو نئے تجربات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس کی وقوفی نشوونما ہوتی ہے۔ پیاژے نے کہا کہ یہ تینوں اعمال بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا یہ بیان نفسیات نمو میں بہت اہمیت رکھتا ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ بچہ ارتقا کی منازل میں انفعالی طور پر اپنے کو ماحول کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بچہ اپنے آس پاس کی چیزوں اور حالات کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور ان کے بارے میں اپنے خیالات قائم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نفسیاتی طور پر ہم ابتدا میں ہر چیز کا اپنے انداز سے مطلب نکالتے ہیں اور اس کو اپنے ذہن میں قائم کرلیتے ہیں۔

اس سلسلے میں پیاژے نے مسلسل تحقیق وتجربات کے بعد "وقوفی نفسیات" سے متعلق ایک نظریہ وضع کیا جو اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ بچوں میں وقوفی نشوونما کی کئی منازل ہیں اور یہ منازل ہر بچے میں یکساں ہوتی ہیں۔ پہلی منزل کو وہ "حسی حرکی" منزل کا نام دیتا ہے اور یہ بچے میں پیدائش سے لے کر دو سال کی عمر تک مقرر کی گئی ہے۔ اس منزل کو اس نے کئی مرحلوں میں تقسیم کردیا ہے، مثلاً بچے کی عمر کے پہلے چار مہینوں میں وہ صرف اضطراری حرکات کے ذریعے علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ابتدائی ردعمل کے اصولوں پر کام کرتا ہے۔ چوسنے کے عمل سے اس کو غذا حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے اس لیے وہ ہر چیز کو منہ میں لے کر اسی آسودگی کے احساس کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد کا مرحلہ اس کی عمر چار ماہ سے بارہ ماہ تک کا ہے۔ اس دوران بچہ ثانوی ردعمل سیکھ جاتا ہے اور اس کی دلچسپی چوسنے کے عمل تک ہی محدود نہ رہ کر دوسری طرز کی آسودگی کی جانب رخ کرجاتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ماحول میں اس کو اور دوسری چیزوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ اس منزل میں پہلے بچہ اپنے کھلونوں سے اپنی دلچسپی مخصوص کردیتا ہے لیکن اس عمر میں اس کی دلچسپی ان کھلونوں سے صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ نظر کے سامنے رہتے ہیں۔ نظروں سے دور ہوئے تو وہ اس کے ذہن سے بھی دور ہوجاتے ہیں لیکن جیسے جیسے اس کی عمر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے بچے میں اپنی پسند کی چیزوں میں دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور پھر ایسا دور آتا ہے جب بچے اپنی پسند کے کھلونوں کو یاد رکھتے ہیں اور اگر وہ ان کی نظر سے دور ہوجائیں تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بارہ ماہ کی عمر کے بعد بچے میں دلچسپیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ہی افعال سے تجربہ حاصل کرنا سیکھ جاتا ہے۔ مثلاً اگر اس کو کوئی ایسا کھلونا دیا جائے جس پر ایک چھوٹی سی لکڑی سے مارنے سے آواز پیدا ہوتی ہے اور اگر بچہ اس آواز کو پسند کرتا ہے تو پھر ہر چیز کو اسی لکڑی سے بجانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب اس کی پسند کی آواز حاصل نہیں ہوتی تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ آواز کسی مخصوص چیز سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ پیاژے کے خیال میں بچہ کی عمر جب 12 مہینے کی ہوجاتی ہے تو اس میں تصور کی صلاحیت پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنے ذہن میں شبیہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک کام کو بار بار دہراتا ہے اور ساتھ ہی وہ کھلونوں سے کھیلنے کے نئے نئے طریقے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری منزل کو وہ "قبل تفاعلی" منزل Preoperational Stage کا نام دیتا ہے۔ اس منزل کی عمر دو سال سے لے کر سات سال تک طے کی ہے۔ اس کو بھی اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی 2 سال سے 4 اور پھر

7 سال تک۔ 2 سال سے 4 سال کی عمر میں بچے میں سیکھنے کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اور وہ ماحول سے مطابقت اور سازگاری پیدا کرنے کے لیے دوسروں کی نقل کرتا ہے اور اس طرح بہت سے کام سیکھ جاتا ہے۔ اس عمر میں اس میں زبان سیکھنے کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنی بات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے۔ 4 سال کی عمر میں بچے میں ادراک کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور وہ مختلف چیزوں کو پہچان سکتا ہے۔ خاص طور پر ان چیزوں کو جو پہلے بھی اس کے تجربے میں آچکی ہوں۔ اس عمر میں وہ رشتوں کی پہچان بھی کرنے لگتا ہے۔ 7 سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد وہ چیزوں کی خصوصیات، جیسے سائز، رنگ، تعداد حجم وغیرہ کے لحاظ سے ان میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچے میں کسی حد تک استدلال کی صلاحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے یا اس کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ ماہر نفسیات اس عمر کو اسکول میں داخلے کی عمر کہتے ہیں کیونکہ یہی وہ عمر ہے جب بچے میں سیکھنے کا عمل تیز ہوجاتا ہے۔ سات سال کی عمر سے پہلے بچے کو کسی باقاعدہ اسکول میں داخل کرنے کو ماہرین نفسیات ان پر تناؤ کی حالت لادنا تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں آج بھی اسکول میں داخلے کی عمر سات سال ہے۔

پیاژے کے خیال میں بچے میں ایک خاص بات یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ خودمرکزیت کا شکار ہوجاتا ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز صرف اسی کے فائدے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اسی عمر میں اس کی انا کی نشوونما میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ وہ انا کا صحیح تصور تو نہیں کرسکتا لیکن خودمرکزیت کی وجہ سے ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض بچوں میں خودمرکزیت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور یہ اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے جب اس کے دوسرا بھائی یا بہن پیدا ہوجائے یا اس کے دوستوں میں سے کوئی دوست اس کی چیزوں کو بانٹنے کی کوشش کرے۔ ہم روزانہ اس بات کا مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ بچہ اپنی ماں کی گود میں کسی دوسرے بچے کو برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ماں کی محبت اور مہربانیاں صرف اس کے لیے ہی ہیں۔

تیسری منزل کو اس نے "معروض تفاعلی" منزل (Concrete Operrational Stage) کا نام دیا ہے۔ اس منزل کی عمر اس نے 7 سال سے 12 سال تک مقرر کی ہے۔ اس عمر میں بچے میں ایک قسم کا استقلال پیدا ہوجاتا ہے۔ استدلال کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے، جن چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے ان کی مختلف خصوصیات جان لینے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ یہ تجسس اس کے سیکھنے کے عمل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ سات سال کی عمر کے بعد بچے میں خاص طور پر وہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ چیزوں کی خصوصیات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے اور انہی خصوصیات کی وجہ سے وہ ان میں فرق پیدا کرتا ہے اور اس فرق کی بنیاد پر وہ ان کی پہچان قائم کرتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی بچے نے اگر لسی کا ذائقہ پہلی مرتبہ لیا ہے تو وہ دودھ اور لسی کے ذائقے میں ہمیشہ کے لیے فرق پیدا کرلے گا۔ اس عمر میں بچوں کی یادداشت پختہ ہوجاتی ہے اور خازنیت کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ رنگ، سائز، خوشبو، شکل اور حجم جیسی خصوصیات کی بنیاد پر چیزوں میں تفریق پیدا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اکثر بچے کھیلتے وقت اپنے کھلونوں کو الگ الگ رکھ دیتے ہیں۔ آپ اگر غور کریں تو کھلونوں یا جن چیزوں سے وہ کھیل رہے ہوں ان کو الگ الگ رکھنے میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جن کھلونوں میں پہیے لگے ہیں وہ الگ رکھے ہوں گے۔ یہ اصناف بندی کی صلاحیت اس کی ذہانت پر دلالت کرتی ہے اور مستقبل میں اس کے بہت کام آتی ہے اور اسی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے قبل پرائمری اسکولوں میں ایسے تعلیمی وسائل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بچہ اپنی اس صلاحیت میں اضافہ کرسکتا ہے۔

چوتھی منزل کو وہ "صوری تفاعلی" منزل (Formal Operational Stage) کہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے 12 سال کی عمر سے سن بلوغت کی عمر طے کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمر بچے میں ایک انقلاب لانے والی عمر ہوتی ہے کیونکہ اس میں نہ صرف جسمانی تبدیلیاں بلکہ نفسیاتی اور جذباتی تبدیلیاں بھی بہت تیزی سے وجود میں آتی ہیں۔ جسمانی نشوونما کی رفتار تیز ہوتی ہے اور بچہ اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کرنے لگتا ہے۔ کچھ بچے اس معاملے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اکثر بچے اپنے آپ میں بڑے ہونے کا احساس تیزی سے کرنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنی عمر سے چھوٹے بچوں سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمر میں بچے کے خیالات میں بھی ایک انقلاب رونما ہوجاتا ہے، سوچ کا انداز بدل جاتا ہے، تصور میں استقلال آجاتا ہے اور اس کا دائرہ بھی وسیع ہوجاتا ہے اور ماضی کے تجربات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس عمر میں تجسس کی صلاحیت کچھ زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ جو چیزیں ان سے پوشیدہ رکھی جائیں ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن خاص بات یہ بھی ہے کہ اس عمر میں پہنچنے کے بعد بچے مفروضات پر زیادہ یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کی حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پیاژے کے نظریات کی نفسیات میں اتنی اہمیت ہے کہ نفسیات کا ایک شعبہ اس کے نام سے منسوب کردیا گیا ہے اور جسے "پیاژین نفسیات" کہا جاتا ہے اور "وقوفی نفسیات" میں تو اس کے کام کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر ہم اس کو نظرانداز کردیں تو نفسیات پر کیے مطالعے کو مکمل کہہ ہی نہیں سکتے۔ یہ پیاژے نے ہی ہمیں بتایا کہ حیاتیات کا حصہ ہوتے ہوئے ہم کس طرح علم حاصل کرتے ہیں اور کس طرح ہم اپنی وقوفی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ منطقی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر بچہ اپنے ماحول سے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے، اور

اس طرح جو معلومات حاصل کرتا ہے اس کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر مستقبل میں اس تجربے کا فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔ ماحول سے اس اہم عمل کی وجہ سے اس کے جسمانی نشو ونما کے ساتھ ساتھ ذہنی نشو ونما بھی ہوتی ہے۔ ژین پیاژے نے نفسیات کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے نظریات سے کوئی ایک شعبہ ہی متاثر نہیں ہوا بلکہ اس نے بچوں کی نفسیات، تعلیمی نفسیات، نشائی نفسیات اور سماجی نفسیات میں بھی اپنے نظریات کے اثرات مرتب کیے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اس کی تحقیقات کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے اور پانچ سو سے زیادہ اس نے مقالات لکھے ہیں۔ اس کی تحقیقات میں خاص طور پر جن کو اہمیت حاصل ہے ان میں "The Construction of Reality in the Child" جو اس نے 1937 میں مکمل کی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ 1954 میں ہوا، اس کتاب میں اس نے اپنے ہی بچوں کی نشو ونما کا جو گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا اس کی مکمل تفصیل ہے۔ یہ کتاب بچوں کی نفسیات میں ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک اور اہم کتاب جو اس نے 1947 میں مکمل کی اور اس کا ترجمہ انگریزی میں 1959 میں ہوا "The Growth of Logical Thinking from Childhood to Adolescence" نام سے تھی۔ اس سے بہت پہلے یعنی 1932 میں وہ ایک کتاب "The Moral Judgement of the Child" کے نام سے شائع کر چکا تھا اس کا انگریزی میں ترجمہ 1947 میں ہوا۔ بچوں کی نفسیات کے موضوع پر اس کی ایک اہم کتاب "The Psychology of the Child" کے نام سے 1966 میں مکمل کی اور اس کا ترجمہ 1996 میں شائع ہوا۔ اس کی ایک اہم تخلیق جو فلسفہ سے تعلق رکھتی ہے "Insight and Illusions of Philosophy" کے عنوان سے 1965 میں شائع ہوئی اور اس کا انگریزی ترجمہ 1971 میں بازار میں آیا۔

پیاژے کی اہمیت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے خیالات سے جن دانشوروں نے اتفاق کیا ان میں جان ڈیوی، ماریا مونٹسری اور پاؤل فرائر بھی شامل ہیں۔ اس نے نہ صرف اپنے دور کے بلکہ ہر دور کے معلمین کے لیے یہ پیغام چھوڑا ہے کہ بچوں کا ذہن خالی برتن نہیں جسے معلومات سے بھرنا ہے بلکہ بچے تو ایک معمار کی حیثیت رکھتے ہیں جو خود معلومات کی بنیاد رکھتے ہیں یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ننھے سائنسداں ہیں جو اپنی تصوری خود بناتے ہیں اور خود ہی اس کو آزماتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں پیاژے کی بصیرت نے ذہن کے پردوں کو کھول کر مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک ایسا دانشور تھا جس نے اپنی کم عمری میں ہی اپنی صلاحیتوں کا سکہ جما دیا تھا اور اپنی عمر کے 75 سال اس نے نفسیات کی خدمت میں صرف کیے۔ ہم اس کو صرف ''وقوفی نفسیات'' کے تعلق سے ہی نہیں یاد رکھیں گے بلکہ اس لیے بھی وہ رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا کہ وہ تعلیم کے شعبے میں اصلاح چاہتا تھا اور اس نے بچوں کی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی ضرورت کو سمجھا اور پہچانا۔ اس کا یہ قول ہمیشہ یاد رہے گا کہ ''کسی مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھا جائے کہ یہ مسئلہ کیسے پیدا ہوا۔''

□□□

B/609, A.K. Tower,
Madina Manzil Comp. S.V. Road,
Goregaon (W) Mumbai-62

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فیروز عالم

سرایڈمنڈ ہلیری — ایک عظیم مہم جو

دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایوریسٹ پر سب سے پہلے پہنچنے والے سرایڈمنڈ ہلیری کا گذشتہ 11 جنوری کو 88 برس کی عمر میں نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں انتقال ہوگیا۔ سرایڈمنڈ ہلیری کا نام کوہ پیمائی کی تاریخ میں سنہرے لفظوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایوریسٹ کی چوٹی کو سر کرکے انھوں نے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا جس تک پہنچنے میں سیکڑوں لوگوں کو ماضی میں اپنی جان گنوانی پڑی۔ ایڈمنڈ ہلیری نہ صرف ایک عظیم مہم جو تھے بلکہ ایک نہایت عظیم انسان بھی تھے۔ نیپال کی شیرپا برادری کی تعلیمی ترقی اور سماجی فلاح کے لیے ان کی کوششوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ایڈمنڈ ہلیری کی پیدائش 20 جولائی 1919 کو آکلینڈ (نیوزی لینڈ) کے علاقے تی منی کلاک میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام پرسیول آگسٹس ہلیری اور ماں کا نام گرٹرڈ ہلیری تھا۔ ایڈمنڈ ہلیری نے ٹواکاؤ پرائمری اسکول اور اس کے بعد آکلینڈ گرامر اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم دو سال پہلے مکمل کرلی لیکن ہائی اسکول میں ان کی کارکردگی بہت اچھی نہیں رہی اور انھیں اوسط نمبر ہی حاصل ہوئے۔ بچپن میں وہ بے حد شرمیلے تھے اس لیے لوگوں سے ملنے جلنے کی بجائے وہ کتابوں میں پناہ ڈھونڈتے تھے اور ایڈونچر سے بھرپور زندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ گھر سے اسکول تک دو گھنٹے کا سفر وہ کتابوں کے مطالعے میں گزارتے تھے۔ انھوں نے آکلینڈ یونیورسٹی کالج میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ 16 برس کی عمر میں اسکول کی جانب سے ماؤنٹ رؤپیہو جانے کے لیے شروع کی گئی ایک مہم کے دوران انھیں کوہ پیمائی کا شوق ہوا۔ 1939 میں انھوں نے جنوبی آلپس کی چوٹی ماؤنٹ اولیور پر پہنچ کر ایک بڑی کامیابی حاصل کی۔

تعلیم ختم ہونے کے بعد ایڈمنڈ ہلیری اپنے بھائی کے ساتھ شہد کی مکھیاں پالنے کا کام کرنے لگے جو ان کا خاندانی پیشہ تھا، لیکن کوہ پیمائی کا شوق برقرار رہا۔ وہ گرمیوں میں شہد کی مکھیاں پالتے اور ان سے ہونے والی آمدنی سے سردی کے موسم میں کوہ پیمائی کا شوق پورا کرتے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں انھوں نے ایئرفورس میں ملازمت کے لیے درخواست دی لیکن درخواست منظور ہونے سے پہلے ہی واپس لے لی کیوں کہ فوج کی نوکری ان کے مذہبی ضمیر کے خلاف تھی۔ بحرالکاہل میں جنگ چھڑنے پر فوج میں جبری بھرتی کی شروعات ہوئی تو ہلیری کو بھی بحریہ میں جہاز رانی کی خدمات انجام دینی پڑیں۔ 1945 میں انھیں فجی اور جزیرہ سولومن بھیج دیا گیا جہاں کشتی کے ایک حادثے میں وہ بری طرح جھلس گئے جس کے بعد انھیں نیوزی لینڈ واپس بھیج دیا گیا۔

ایڈمنڈ ہلیری 1951 میں اس برطانوی مہم کا حصہ بنے جو ایرک شپٹن کی قیادت میں ماؤنٹ ایوریسٹ پر پہنچنے کے لیے شروع کی گئی۔ 1952 میں ہلیری اور ان کے دوست جارج لووے نے ایرک شپٹن کی قیادت میں چواویو پہنچنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ 1952 میں ہرتنزنگ نورگے (جو بعد میں ماؤنٹ ایوریسٹ پر پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن چوٹی سے 800 فٹ نیچے سے ہی خراب موسم کی وجہ سے انھیں واپس لوٹنا پڑا تھا۔ ہلیری اور ان کے دوست جارج لووے کو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچنے والی ایک مہم کا حصہ بننے کی دعوت دی گئی جو انھوں نے قبول کرلی۔

اس ٹیم کی قیادت ہنسٹ کے ذمے تھی۔ ہلیری اپنے دوست جارج لووے کے ساتھ ایوریسٹ پر چڑھنا چاہتے تھے لیکن ہنسٹ نے اس کے لیے دو ٹیمیں تشکیل دیں۔ پہلی ٹیم ٹام بورڈیلون اور چارلس ایوانس پر مشتمل تھی اور دوسری ٹیم کے ارکان ایڈمنڈ ہلیری اور تنزنگ نورگے تھے۔ اس مہم میں کل چار سو لوگ شریک تھے جس میں 362 افراد سامان ڈھونے کے لیے رکھے گئے تھے اور 20 شیرپا گائیڈ تھے۔ مارچ 1953 میں ٹیم نے Base Camp قائم کیا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے 25900 فٹ کی بلندی پر ٹیم نے اپنا آخری پڑاؤ ڈالا۔ 26 مئی 1953 کو بورڈیلون اور ایوانس نے چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کی لیکن ایوانس کا آکسیجن سسٹم ناکارہ ہوجانے کی وجہ سے انھیں واپس لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد ہنسٹ نے ہلیری اور تنزنگ کو ایوریسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کی ہدایت دی۔

برف باری اور تیز ہوا نے ہلیری اور تنزنگ کو دو دن تک آگے نہیں بڑھنے دیا۔ 28 مئی کو وہ لوگ تین معاونین جارج لووے، الفریڈ گریگوری اور آنگ نیما کے ساتھ آگے بڑھے۔ ہلیری اور تنزنگ نے 27900 فٹ کی بلندی پر اپنا خیمہ لگایا اور وہاں سے ان کے تینوں معاونین واپس لوٹ گئے۔

29 مئی کی صبح ہلیری جب خیمے سے باہر نکلے تو ان کے بوٹ (Boot) برف میں جم گئے۔ ان لوگوں نے دو گھنٹے تک آگ سے سینک کر اپنے آپ کو گرم کیا۔ اس کے بعد وہ 14 کیلو سامان اٹھائے ہوئے فیصلہ کن چڑھائی کے لیے آگے بڑھے۔ چڑھائی کے آخری مرحلے میں نازک موڑ وہ 40 فٹ کی چٹان تھی جسے بعد میں Hillary Step کے نام سے جانا گیا۔ ہلیری چٹان کی دیوار اور برف کے درمیان پڑے شگاف کے راستے آگے بڑھے۔ تنزنگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد کا راستہ آسان تھا۔ وہ جب دنیا کے سب سے بلند مقام ایوریسٹ کی 29028 فٹ بلند چوٹی پر پہنچے تو اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے ہلیری نے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

''پہلے تو ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں۔ پوری دنیا

ہمارے آس پاس ایک وسیع وعریض رنگین نقشے (Relief Map) کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میں خوش قسمت ہوں کہ میں نے جو خواب دیکھا وہ سچ ثابت ہوا۔ انسان کی زندگی میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔''

وہ پندرہ منٹ تک وہاں رہے۔ ہلیری نے تمزنگ کی تصویر کھینچی لیکن تمزنگ چونکہ کیمرے کے استعمال سے ناواقف تھے اس لیے وہ ایوریسٹ پر ہلیری کی تصویر نہیں کھینچ سکے۔ ہلیری نے وہاں یادگار کے طور پر ایک صلیب اور تمزنگ نے کچھ چاکلیٹ چھوڑے ایوریسٹ سے نیچے اترتے وقت بھی انھیں بے حد احتیاط سے کام لینا پڑا کیوں کہ برفباری کی وجہ سے ان کا راستہ ڈھک گیا تھا۔ واپسی میں سب سے پہلے ان کی ملاقات جارج لووے سے ہوئی جو ان کے لیے گرم سوپ لے کر اوپر آئے۔

برطانیہ میں اس کامیاب مہم کی خبر ملکہ الیزابیتھ دوئم کی تاج پوشی کے دن پہنچی۔ کوہ پیاؤں کی ٹیم کٹھمنڈو پہنچنے کے بعد اپنے شاندار استقبال سے حیرت زدہ رہ گئی۔ ہلیری اور تمزنگ راتوں رات ہیرو بن گئے تھے۔ بین الاقوامی برادری نے ان کی بے مثال کامیابی پر کھلے دل سے مبارک باد دی۔ ملکہ الیزابتھ دوئم کی جانب سے ایڈمنڈ ہلیری کو سر کا خطاب دیا گیا اور تمزنگ نورکے کو برطانیہ کے اعلیٰ شہری اعزاز ''برٹش ایمپائر میڈل'' سے سرفراز کیا گیا۔

ماؤنٹ ایوریسٹ کی چوٹی سر کرنے کے بعد ہلیری 1956، 1960-61 اور 1963-65 کی مہمات میں مزید دس چوٹیوں پر پہنچے۔ وہ 4 جنوری 1958 کو قطب جنوبی پر بھی پہنچے۔

1979 میں ہلیری قطب جنوبی کے علاقے کا ہوائی نظارہ کرنے والے طیارے نیوزی لینڈ فلائیٹ 901 میں بطور کمنٹیٹر جانے والے تھے لیکن بعض دوسرے کاموں کی وجہ سے وہ نہ جاسکے اور ان کی جگہ ان کے دوست پیٹر ملگریو کو لیا گیا۔ یہ جہاز ماؤنٹ اریبس پر حادثے کا شکار ہوگیا اور اس پر سوار بھی 257 افراد ہلاک ہوگئے۔ ہلیری نے بعد میں 21 دسمبر 1989 کو پیٹر ملگریو کی بیوہ جون ملگریو سے شادی کرلی۔

ہلیری نے 1975 کے عام انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ 1985 میں انھیں ہندوستان میں نیوزی لینڈ کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر اور نیپال کے سفیر کی اضافی ذمے داری بھی دی گئی۔ اس طرح انھوں نے نئی دہلی میں ساڑھے چار سال گزارے۔

ایڈمنڈ ہلیری 1985 میں نیل آرم اسٹرانگ (چاند پر پہنچنے والے سب سے پہلے آدمی) کے ساتھ دوہرے انجن والے جہاز سے قطب شمالی پر پہنچے۔ اس طرح وہ قطب شمالی، قطب جنوبی اور ماؤنٹ ایوریسٹ پر پہنچنے والے پہلے شخص بن گئے۔

1992 میں نیوزی لینڈ کے 5 ڈالر کے نوٹ پر سر ایڈمنڈ ہلیری کی تصویر چھاپی گئی۔ وہ نیوزی لینڈ کے پہلے آدمی تھے جس کی زندگی میں اس کی تصویر بینک کے نوٹ پر شائع ہوئی۔ دراصل اس وقت کے نیوزی لینڈ ریزرو بینک کے گورنر ڈان براش کسی مرحوم کھلاڑی کی تصویر 5 ڈالر کے نوٹ پر چھاپنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے کوئی موزوں آدمی نہ مل سکا اور اس طرح یہ قرعہ سر ایڈمنڈ ہلیری کے نام نکلا۔

ایوریسٹ کی پہلی کامیاب مہم کے پچاس برس پورے ہونے کے موقعے پر حکومت نیپال نے گولڈن جوبلی تقریب کا انعقاد کیا جس میں سر ایڈمنڈ ہلیری کو نیپال کی اعزازی شہریت پیش کی گئی۔ وہ پہلے غیر ملکی تھے جنھیں حکومت نیپال کا یہ اعزاز حاصل ہوا۔

سر ایڈمنڈ ہلیری نے 3 ستمبر 1953 کو لوئس میری روز سے پہلی شادی کی۔ ان کے تین بچے ہوئے۔ بیٹا پیٹر ہلیری (پ۔ 1954)، بیٹا سارہ، (پ۔ 1955) اور بیٹی بیلنڈا (پ۔ 1959)۔ 1975 میں سر ایڈمنڈ ہلیری کو ایک زبردست سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی بیوی اور چھوٹی بیٹی نیپال کے ایک گاؤں میں ان سے ملنے جارہے تھے جہاں وہ اسپتال بنوا رہے تھے لیکن کٹھمنڈو سے ان کا جہاز اڑان بھرنے کے فوراً بعد حادثے کا شکار ہوگیا اور وہ دونوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ایڈمنڈ ہلیری کے بیٹے پیٹر نے 1990 میں ایوریسٹ کی چوٹی سر کی۔ 2003 میں ایوریسٹ پر پہنچنے کے 50 سال پورے ہونے کے موقعے پر پیٹر ہلیری تمزنگ نورکے کے بیٹے جاملنگ نورکے کے ساتھ ایوریسٹ کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

ایوریسٹ کی چوٹی سر کرنے کے بعد ایڈمنڈ ہلیری نے کوہ پیمائی کی متعدد مہمات انجام دیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیپالی عوام کی فلاح و بہبود میں ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ نیپالی عوام کی غربت اور پریشان حالی سے بے حد فکرمند تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ہمالین ٹرسٹ قائم کیا اور کروڑوں روپئے جمع کیے۔ اس رقم سے انھوں نے ہمالیہ کے دوردراز علاقوں میں اسکول اور اسپتال بنوائے۔ وہ ہمالیہ کے آس پاس کے ماحولیاتی انحطاط سے بھی فکرمند تھے۔ انھوں نے نیپالی حکومت کو جنگلوں کی حفاظت اور ایوریسٹ کے آس پاس کے علاقے کو قومی پارک قرار دینے کے لیے قانون بنانے پر رضامند کیا۔ اس قومی پارک کے لیے نیوزی لینڈ حکومت سے انھوں نے مالی تعاون اور تکنیکی مدد بھی دلوائی۔

سر ایڈمنڈ ہلیری تیرہ کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے Crossing of Antarctica 'The Changing Face of Earth اور From the Ocean to the sky جیسی مہم جوئی پر بہترین کتابیں لکھیں۔

11 جنوری 2008 کی صبح 9 بجے آکلینڈ سٹی اسپتال میں دل کی دھڑکن رک جانے کے سبب سر ایڈمنڈ ہلیری کی موت ہوگئی۔ ایوریسٹ کا فاتح موت سے ہار گیا۔ ان کی وفات سے ہم نہ صرف ایک عظیم مہم جو سے محروم ہوگئے بلکہ ایک ایسے عظیم انسان سے بھی محروم ہوگئے جس کے دل میں انسانوں کے لیے بے پناہ پیار اور خلوص تھا اور جس کی زندگی کا بیشتر حصہ غریب اور ناخواندہ افراد کی فلاح و بہبود میں صرف ہوا۔

□□□

Distance Education, MANNU, Hyderabad

عبدالباری مسعود

گھریلو دھواں انسانی جانوں کا چوتھا بڑا قاتل!

کیا آپ جانتے ہیں! گھر کے چولھوں سے اٹھنے والا دھواں کس قدر مہلک اور جان لیوا ہوتا ہے؟ بظاہر بے ضرر معلوم ہونے والا یہ قاتل دھواں ہر 20 سیکنڈ پر ایک فرد کو دنیا سے رخصت کر دیتا ہے۔ اس سے دنیا بھر میں ہر سال 16 لاکھ افراد، جن میں بچوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہے، لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور ان اموات میں پانچ لاکھ سے زیادہ اموات اکیلے ہندوستان میں واقع ہوئی ہیں جو پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ قاتل دھواں ناقص تغذیے، غیر محفوظ سیکس (جنسی بے راہ روی) اور صاف پانی، اور صفائی ستھرائی کے فقدان کے بعد صحت کے لیے چوتھا بڑا خطرہ ہے۔ یہ چونکا دینے والے حقائق ایک درجن سے زائد جائزوں میں سامنے آئے ہیں جن کا اہتمام عالمی ادارۂ صحت (World Health Organisation) نے کیا تھا۔ اس مضر رساں دھوئیں کا سبب ہے روایتی ٹھوس ایندھن جیسے لکڑی، گوبر اور گھاس پھوس کا استعمال، جو گھروں کی چار دیواری کی فضا میں کثافت گھول دیتا ہے جس کے لیے ماہرین Indoor Air Pollution کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

اس وقت دنیا بھر میں بالخصوص ترقی پذیر اور غریب ملکوں کی تقریباً تین ارب آبادی گھروں میں پکوان اور دیگر کاموں کے لیے روایتی ٹھوس ایندھن جیسے لکڑی، جانوروں کی لید، گوبر، گھاس پھونس اور فضلوں کا بھوسا استعمال کرتی ہے۔ اس ایندھن سے جو دھواں اور گیس پیدا ہوتی ہے وہ صحت کے لیے انتہائی مضر ہوتی ہے بالخصوص ایسے مکانوں کے باورچی خانوں میں جن میں روشنی اور تازہ ہوا کے نکاس کے لیے روشن دان نہیں ہوتے۔ وہاں یہ مسئلہ نہایت خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔

سائنس داں باورچی خانوں سے نکلنے والے اس دھوئیں کو خاموش قاتل (Silent Killer) قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق دھوئیں میں پائے جانے والے ذرات پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں عمل تنفس کی متعدد بیماریاں جیسے نمونیا، حلق کی سوجن اور نرخروں کا ورم وغیرہ لاحق ہوتی ہیں۔ یہ صورت حال ترقی پذیر ملکوں میں بڑی سنگین ہے۔

ہندوستان میں یہ صورت حال سب سے زیادہ سنگین ہے جہاں روایتی ٹھوس ایندھن کا استعمال صدیوں سے چلا آرہا ہے بالخصوص دیہی علاقے اس سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ سروے کے مطابق ہندوستان میں 75 فیصد گھروں میں ٹھوس ایندھن کا استعمال ہوتا ہے یعنی تقریباً 13 کروڑ خاندان کثافت زدہ دھوئیں (IAP) سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی 11 ریاستوں میں 40 لاکھ سے زیادہ دیہی افراد اور خاندان اس کی لپیٹ میں ہیں۔ ہندوستان کے متعلق یہ اعداد و شمار امریکی ماہر پروفیسر کرک نے تیار کیے ہیں۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کثافت زدہ دھوئیں کے خطرناک مضمرات کے بارے میں لوگوں کو علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر پریا درشنی کروے نے بتایا کہ ایک عام ہندوستانی کو اس مسئلے کی سنگینی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔

Commercialisation of Biomass Fuels and Cooking Devices نامی پروجیکٹ کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر کروے نے بتایا کہ دیہی علاقوں میں صدیوں سے روایتی ایندھن کا استعمال ہوتا آرہا ہے اور ان مکانوں میں جہاں کھانا پکانے کی جگہ ہوتی ہے وہاں دھوئیں کی نکاسی کا کوئی نظم نہیں ہوتا۔ کثافت زدہ دھوئیں سے سب سے زیادہ متاثر عورتیں اور بچے ہوتے ہیں جو قبل از وقت ہی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں یا امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں حاملہ عورتوں کے شکم میں پرورش پاتا بچہ بھی متاثر ہوتا ہے۔

ترقی کے بڑے بڑے دعووں کے باوجود ہندوستان کی دو تہائی آبادی آج بھی روایتی ایندھن پر منحصر ہے جس میں بالخصوص مویشیوں کا گوبر بڑے پیمانے پر استعمال ہوتا ہے۔ ان سے نکلنے والے قاتل دھوئیں کے تدارک کے لیے اب مختلف رضا کار ادارے میدان عمل میں آرہے ہیں۔ یہ ادارے اور تنظیمیں ملک میں ایندھن کے متبادل طریقوں کو رائج اور مقبول بنانے کے ساتھ ساتھ دھوئیں کی کثافت کے مضمرات سے لوگوں کو واقف کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے دنیا کی متعدد حکومتوں اور اداروں نے پارٹنرشپ برائے کلین انڈور ایئر (گھروں میں کثافت سے پاک ہوا) کے نام سے ایک مشترکہ پروگرام شروع کیا ہے یہ پروگرام ستمبر 2007 میں جوہانسبرگ میں ''پائیدار ترقی'' کے عنوان سے ہوئی عالمی کانفرنس میں وضع کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں 120 سے زیادہ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور تنظیمیں شامل ہیں۔ جس کے مقاصد میں روایتی ایندھن کا متبادل اور آلودگی سے پاک ایندھن فراہم کرنا، لوگوں میں صحت کے تئیں بیداری پیدا کرنا اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس پروگرام کے رکن ملکوں میں کناڈا، چین، فرانس، گھانا، ہندوستان، سری لنکا، ماریشس اور امریکہ وغیرہ کل 19 ممالک شامل

ہیں۔ ہندوستان میں اسی پروگرام کے تحت ایک فورم کلین انڈور ایئر فورم کے نام سے بنایا گیا ہے، اس پروگرام کے تحت تجرباتی طور پر مہاراشٹر کے ایک گاؤں کھانوا کو چنا گیا جو ممبئی کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ گاؤں پہلی نظر میں ہندوستان کے دوسرے دیہاتوں کی طرح لگتا ہے۔ لیکن اس گاؤں کی عورتوں نے اسے دھوئیں سے پاک گاؤں میں بدل دیا ہے۔ دیہی ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ڈاکٹر آر اوما نے بتایا کہ شیل فاؤنڈیشن (Shell Foundation) کے تعاون سے گاؤں میں ایسے جدید طرز کے اسٹوو فراہم کیے گئے جن میں استعمال ہونے والا ایندھن دھواں نہیں چھوڑتا۔

اس پروگرام کے تحت متبادل ایندھن کے ذرائع جیسے لکڑی سے بنائی گئی چارکول، بائیوگیس، اناج اور پھلوں کے اسٹارچ سے بنائی گئی گیس فراہم کی جارہی ہے۔

کھانوا گاؤں کی ایک خاتون اندوبائی نے کہا کہ پرانے طرز کے چولھے پر کھانا بناتے وقت میں کھانسا کرتی تھی لیکن نئے چولھے سے ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے ایندھن بھی کم استعمال ہوتا ہے اور اب مجھے لکڑیاں چننے میں پہلے کے مقابلے آدھے سے بھی کم وقت لگتا ہے ایک دوسری خاتون شکنتلا پاٹل نے بتایا کہ اس سے پہلے ہفتے میں 10 کلوگرام لکڑی بطور ایندھن خرچ ہوتی تھی لیکن اب صرف پانچ کلوگرام لگتی ہے۔ اور کھانا پکانے میں اب دو گھنٹے کی جگہ ایک گھنٹہ لگتا ہے۔

شیل فاؤنڈیشن نہ صرف نئے اور جدید ڈیزائن کے اسٹوو تیار کرنے بلکہ انھیں ہر گھر میں نصب کرنے کی طرف بھی توجہ دے رہا ہے۔ سیمنٹ اور دیگر اشیا سے بنائے گئے یہ چولھے آلودگی پیدا نہیں کرتے۔ ایک چولھے کی قیمت 300 روپئے مقرر ہے۔ غریب دیہاتوں میں ان چولھوں کی فراہمی کے لیے فاؤنڈیشن نے مقامی سطح پر سیلف ہیلپ گروپ تشکیل دیے ہیں۔ رضا کاروں نے بتایا کہ یہ گروپ دیہی باشندوں کو چولھے کی خرید کے لیے قرض فراہم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں گاؤں کی آلودگی سے پاک ایندھن فراہم کرنے کے لیے فاؤنڈیشن کیمونٹی سینٹر بایوگیس یا بایوماس کے پلانٹ بھی لگاتا ہے۔ یہ اسکیم 10 ہزار روپئے اور پانچ ہزار روپئے لاگت کی ہے۔ فاؤنڈیشن نے اب تک دو لاکھ سے زیادہ چولھے فروخت کیے ہیں۔ دس لاکھ سے زیادہ افراد کی زندگیوں کو بہتر کیا ہے۔ فاؤنڈیشن کا آئندہ پانچ برسوں میں پانچ ملکوں ہندوستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، نیپال اور مالدیپ میں 20 ملین جدید طرز کے چولھے فروخت کرنے کا منصوبہ ہے۔ فاؤنڈیشن نے اس پروگرام کے لیے 2006 میں ایک کروڑ ڈالر کی رقم فراہم کی تھی۔

ماہرین کی رائے ہے کہ 2020 تک روایتی ٹھوس ایندھن کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں قابل لحاظ اضافہ ہوگا جو ہر سال لاکھوں لوگوں بالخصوص بچوں اور عورتوں کی جان لے رہا ہے اس کے تدارک اور اس کے بارے میں بیداری لانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

□□□

Flat No. 9, 3rd Floor,
Hamdard Officers Flats,
Jha House, 168/2,
Hzt Nizamuddin (West)
New Delhi-110013

مسدود راہیں

ترجمہ وتعارف ——زاہدہ زیدی

''مسدود راہیں'' میں پانچ اہم ترین جدید مغربی ڈراموں کا ترجمہ وتعارف زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔ زندگی اور موت، تلاش ذات، عرفان کائنات، تنہائی اور مابعد الطبیعیاتی خلا، انسانی صورت حال، لامحدود کائنات میں انسان کا مقام اور معنی کی تلاش جیسے گہرے اور بنیادی مسائل پر مبنی یہ ڈرامے فنی ندرت اور گہری معنویت کے باوصف جدید مغربی ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تعلق بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والی ایک ایسی ڈرامائی تحریک یا اسلوب سے ہے جس نے جدید مغربی ڈرامے کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے روشناس کرایا اور ڈرامے کے وسیع تر امکانات کو بروئے کار لاکر وجودی تجربے کی گہرائی میں اترنے، لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے اور ذہن انسانی کے اسرار ورموز کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔

صفحات: 406، قیمت -/126 روپے

رشید انصاری

انتظار حسین سے گفتگو

انتظار حسین ان قلمکاروں میں ہیں جنھیں 1960 کے بعد اردو افسانے کی گھٹی ہوئی مقبولیت کے دور میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔ اس بحرانی دور میں داستانوی اسراریت کی فضا میں علامتوں کو چابکدستی سے استعمال کرتے ہوئے انتظار حسین نے دوسرے افسانہ نگاروں کے رویے اور روش سے انحراف کیا اور اپنی راہ سب سے الگ نکالی۔ ملک کی تقسیم کے بعد رونما ہونے والے المیوں اور ترک وطن یا ہجرت کے مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں بڑے انداز میں پیش کیا۔

حیدرآباد میں ان کی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ان سے طویل ملاقات کی ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے والے پروفیسر بیگ صدر شعبہ مرکزی جامعہ (سنٹرل یونیورسٹی) حیدرآباد کا تہہ دل سے شکریہ ادا کریں۔

انتظار حسین صاحب کی پیدائش 1925 میں قصبے دیوائی (ضلع بلند شہر، یوپی) میں ہوئی جو ان کا آبائی وطن ہے۔ 1947 میں جب انھوں نے پاکستان ہجرت کی تو وہ ایم.اے. کر چکے تھے۔ پاکستان جانے کے بعد سے ہی وہ لاہور میں مقیم ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ لاہور میں ان کے قیام کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سب سے پہلے لاہور گئے اور لاہور کو اپنے مستقل قیام کے لیے پسند کیا۔ لکھنے لکھانے کے بارے میں انتظار صاحب کا کہنا تھا کہ لکھنے کا جذبہ اور شوق ان کے دل میں شروع ہی سے تھا۔ کسی بیرونی ترغیب کا اس میں دخل نہیں ہے۔ 1947 ہی میں انھوں نے لکھنا شروع کیا اور اپنی تحریروں کی اشاعت کے لیے ان کو زیادہ انتظار ہی نہیں کرنا پڑا تھا۔ افسانے اور ناول لکھنے کے علاوہ سالہا سال تک لاہور کے روزنامہ ''مشرق'' میں ''لاہور نامہ'' کے عنوان سے ادبی سماجی اور ثقافتی موضوعات پر انھوں نے کالم لکھے۔ آج کل انگریزی روزنامہ ''ڈان'' (Dawn) کے لیے انھی موضوعات پر کالم لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنی پرانی کہانیوں کو بھی ازسرنو لکھ رہے ہیں۔ دوبارہ لکھی گئی پرانی کہانیوں کا مجموعہ گذشتہ سال 2007 میں شائع ہوا ہے۔

ہجری ادب کے تعلق سے انتظار صاحب کا خیال ہے کہ انھوں نے یا کسی اور نے ہندوستان سے پاکستان جا کر جو لکھا ہے اس کی نوعیت لندن، یا ہندوستان اور پاکستان سے باہر کسی اور جگہ نقل مکانی کرنے کے بعد لکھی جانے والی تحریروں سے مختلف ہے۔ ہندوستان سے سید علی باقر مرحوم کے لندن نقل مکانی کرنے کے بعد انھیں جو تجربے ہوئے ان پر ان کی لکھی ہوئی تحریریں اور وہ تحریریں جو میں نے پاکستان جا کر لکھیں، ایک زمرے میں نہیں آسکتی ہیں کیونکہ بنیادی طور پر ہجرت یا نقل مکانی کی نوعیت مختلف ہے۔ وہ معاشی ہجرت ہے جو روزگار کے لیے یا ملازمت کے لیے کسی دوسرے شہر یا ملک کو کی جاتی ہے۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی نوعیت قطعی مختلف ہے۔ ان دونوں ہجرتوں کا تقابل کرنا الجھن پیدا کرنے کا سبب ہوگا۔ انتظار صاحب نے زور دے کر اس بات کو دہرایا کہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان کی جانے والی ہجرت لندن، ٹورانٹو، دبئی اور جدہ روزی روزگار کے لیے کی جانے والی ہجرت سے مختلف ہے دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ دونوں ہجرتوں کے بعد درپیش آنے والے حالات اور تجربات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔

انتظار صاحب کے افسانوں کا اساطیری داستانوں سے گہرا تعلق رہا ہے، اسی تناظر میں ہمارا سوال تھا کہ افسانوں میں اساطیری داستانوں اور ان کی اسراریت کو شامل کرنے پر ادبی حلقوں کا کیا ردِعمل تھا؟ انتظار صاحب نے اپنے جواب میں کہا کہ اس پر صرف ترقی پسندوں نے شدید اعتراض کیا تھا اور وہ زور دے کر کہا کرتے تھے کہ ''یہ تو ماضی میں چلا گیا ہے، داستانوں اور اس قسم کی چیزوں پر لکھ رہا ہے، یہ تو رجعت پسند ہے۔'' انتظار صاحب کا لاہور کے حلقۂ ارباب ذوق سے جو بھی تعلق رہا حلقے کے تعلق سے ہمارے سوال کے جواب میں کہا کہ حلقے میں ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ مزید کہا کہ حلقۂ ارباب ذوق میں ترقی پسند بھی آتے تھے، وہ تو ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جہاں ترقی پسند غیر ترقی پسند سب ہی آتے تھے کسی پر کوئی پابندی نہ تھی بلکہ ایک آزاد فضا تھی۔ یہ پابندیاں تو ترقی پسندوں نے لگا رکھی تھیں کہ ہماری تنظیم یا انجمن میں یہ نہ ہو وہ نہ ہو، ہم اپنے رسالے میں غیر ترقی پسند کو نہیں چھاپیں گے۔ حلقۂ ارباب ذوق میں یہ آمریت نہیں تھی۔ آپ کسی قسم کی تحریر پڑھیں اس پر کھلی بحث ہوتی تھی۔ آزادی سے ہر کوئی اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ انتظار صاحب نے کہا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ''حلقۂ ارباب ذوق'' میں ان کی تحریروں کو پسند کیا گیا یا نہیں؟ لیکن کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ ''یہ رجعت پسندی ہے، یہ ماضی میں چلا گیا ہے۔'' ادب کو پرکھنے کا یہ انداز ترقی پسندوں سے مخصوص رہا ہے۔ جو غیر ترقی پسند اس انداز میں بات کرتے ہیں وہ بھی ترقی پسندوں ہی کے زیر اثر ہیں۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں انتظار صاحب نے کہا کہ میں ''اساطیری'' کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا ہوں میں اسے ''دیومالا'' کہتا

ہوں۔ دیومالا میری نظر میں برصغیر کی ہندو دیومالا ہے۔ ایک دیومالا کا تعلق یونان کے دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں سے ہے۔ مصر کی بھی ایک دیومالا ہے۔ انتظار صاحب نے فرمایا کہ ہندو دیومالا کا تعلق ہندو مذہب کے دیوی دیوتاؤں سے ہے۔ یہ ہندو مذہب اور تہذیب کا اہم حصہ ہے اس لیے ہندوستان میں رہتے ہوئے انھیں اس سے تھوڑی بہت آشنائی تھی لیکن تفصیلی مطالعہ پاکستان جا کر ترجموں کی مدد سے کیا تھا۔ ہندوستان میں رام لیلا دیکھنے سے ان کو پتہ چل سکا کہ رامائن میں کیا ہے؟ راون کون تھا؟ وشنو اور شیو سے بھی تھوڑا بہت تعارف ہوا تھا لیکن دیومالا سے باقاعدہ تعارف کتابیں پڑھنے سے ہوا۔" ہندی میں زیادہ نہیں جانتا ہوں، سنسکرت سے تو بالکل ہی آشنائی نہیں ہے اس لیے جو کچھ پڑھا ترجموں کی مدد سے پڑھا۔ دیومالائی کہانیوں کے ترجمے لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں موجود تھے کیونکہ لاہور ایک ایسا شہر ہے جو ہندو تہذیب کا بھی مرکز رہا ہے۔ سنسکرت میں لکھی گئی دیومالا کے سارے ترجمے آسانی سے مل جاتے تھے۔"

دیومالا سے اپنی دلچسپی پر انتظار حسین صاحب نے خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر ہم اور آپ مغرب سے آئے ہوئے فکشن (Fiction) تک محدود رہتے ہیں۔ مغربی ناول اور کہانیاں ہم پڑھتے ہیں، روسی فرانسیسی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے ناولوں، افسانوں کے ترجمے ہم انگریزی جاننے کی وجہ سے انگریزی میں پڑھ لیتے ہیں اس لیے تھوڑی بہت شناسائی اس فکشن سے ہے۔ ہمارے ہاں کچھ تحریکیں ایسی تھیں جنھوں نے پرانے ادب کو بالکل رد کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے غزل کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ اسے وہ مار دینا چاہتے تھے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ غزل بڑی سخت جان نکلی وہ مر نہ سکی۔ مولانا حالی نے بھی کہا تھا کہ غزل کو ترک کر دینا چاہیے۔ پھر فری ورس یعنی آزاد نظموں والے لوگ آئے۔ جوش ملیح بھی اسی قبیل کے تھے، ان سب کا خیال تھا غزل کا زمانہ ختم ہو رہا ہے لیکن غزل زندہ رہی۔ ممکن ہے کہ غزل کو رد کرنے کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کے بعد شاید بہتر شاعری ہو سکے تاہم اس کا فیصلہ تو کوئی نقاد ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس عرصے میں غزل اور غزل سے ہٹ کر کی جانے والی نئی شاعری کتنی بہتر اور معیاری ہے۔ اس طرح کا موازنہ کرنے کے بعد ہی پتہ چل سکتا ہے کہ غزل اور نئی شاعری میں کس کا پلہ بھاری ہے اور کون کتنے پانی میں ہے؟

انتظار صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا" داستانوں کے تعلق سے یہ عرض کروں کہ فکشن میں ہماری جو روایت تھی جس کو داستان کہتے ہیں اسے سرسید تحریک کے مصلحین نے سب سے پہلے رد کیا۔ اس کی وجہ ان کا "جوش اسلام" تھا اس کے بعد ایسے بھی مصلحین پیدا ہوئے جو کہتے تھے کہ دیومالائی داستانوں کو آگ میں پھینک دینا چاہیے، بھاڑ میں جھونک دینا چاہیے۔ اس کے بعد ترقی پسندوں نے بھی داستانوں کو مسترد کیا۔ نئے ادب یا جدیدیت والوں کو بھی ان میں کوئی معنی نظر نہیں آتے تھے لیکن میں نے اس روایت کو قبول کرنے کی کوشش کی کہ یہ ہماری روایت ہے اور میں اس سے استفادہ کر سکتا ہوں اور مجھے کرنا چاہیے۔ میری سوچ یہ تھی کہ اگر منٹو، کرشن چندر اور بیدی نے اس سے استفادہ نہیں کیا تو مجھے اس سے غرض نہیں ہے میں اس سے استفادہ کرنا چاہوں گا کیونکہ وہ میری روایت ہے۔ اس روایت سے گزرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اس کے پیچھے بھی کوئی روایت ہے۔ ہماری داستانوں میں زیادہ تر داستانوں کا تعلق عرب و عجم سے ہے۔ ان داستانوں میں بیچ بیچ میں وہ داستانیں بھی آتی ہیں جو اس دھرتی سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً "نل و دمن" اور "شکنتلا" وغیرہ ان داستانوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی لیکن میں نے جب انھیں اہمیت دی تو مجھے احساس ہوا کہ ان داستانوں کے پیچھے اور بھی داستانیں ہیں "نل و دمن" اور "شکنتلا" جیسی داستانوں کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے یہ کہانیاں چلی ہیں؟ میں نے ان سرچشموں تک پہنچنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ان داستانوں کا سرچشمہ ہندو دیومالا ہے۔ اگر کوئی ہندو دیومالا سے واقف نہیں ہوتا ہے اور ان سے متعارف ہو کر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے تو پھر ہند سے تعلق رکھنے والی داستانوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا ہے۔ اسی لیے روایتی داستانوں کو سمجھنے کے لیے میں نے ہندو دیومالا کا مطالعہ کیا اور براہ راست ان تک پہنچنے کی کوشش ترجموں کے ذریعے کی۔"

داستانوں کے بعد اردو ناول کے تعلق سے ہم نے سوال کیا کہ کیا اردو میں بڑے ناولوں کی کمی ہے؟ جواب میں انتظار صاحب نے ہم سے ہی سوال کیا کہ بڑے ناول سے کیا مراد ہے؟ بڑا ناول کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ناول ہو یا افسانہ اچھا ہوتا ہے یا برا۔ ناولوں کی معیار کے لحاظ سے درجہ بندی کرتے وقت اچھے ناول کو اونچا درجہ دیا جاتا ہے مثلاً بڑا ناول روسی ادب کا شاہکار وار اینڈ پیس (War & Peace) ہے۔ ترقی پسند جیلک "ماں" کو بڑا ناول مانتے ہوں لیکن میں نہیں مانتا ہوں۔" انتظار صاحب نے کہا کہ "ہمیں اردو میں "وار اینڈ پیس" کا ہم مرتبہ ناول تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ یورپی ناول اور سارا فکشن ایک طویل دور جو صدیوں پر مشتمل ہے گزار چکے ہیں۔ ہر جگہ خواہ روس ہو فرانس ہو یا برطانیہ ہر جگہ فکشن نے لمبا سفر طے کیا ہے جبکہ ہندوستان میں ناول ہو یا مختصر کہانی یہ سب 1857 کے بعد آئے ہیں۔ ہمارے ہاں ان اصناف کی عمر، تاریخ اور تجربے مختصر ہیں اس لیے "وار اینڈ پیس" کے مرتبے کا ناول اردو میں تلاش کرنا غلط ہوگا۔ ہمارا سفر تو بے حد مختصر ہے۔" وار اینڈ پیس" جیسا ناول اردو میں ہے تو کون سا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں لکھا گیا؟ ایسے سوالات نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے تھوڑا سا موازنہ ان

سے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اردو ناولوں کے بارے میں انتظار صاحب نے بتایا کہ لڑکپن میں تو مجھ کو "فسانۂ آزاد" بے حد پسند تھا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ ناول ہے یا نہیں، تاہم فکشن ضرور ہے۔ 19ویں صدی میں ناول کا جو سانچہ تھا وہ اس سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہے۔ اس سانچے میں ڈھلا ہوا ایک عمدہ ناول "امراؤ جان ادا" اور پریم چند کا ناول "گئودان" ہے۔ یہ دونوں اردو میں کلاسیک مانے جاتے ہیں۔ "فسانۂ آزاد" کو نقاد کس زمرے میں شمار کرتے ہیں وہ جانیں میں تو اسے کلاسیکس Classics میں کلاسیک مانتا ہوں۔ اس میں ایک پوری تہذیب کا بیان ہے۔"

ہماری اس بات سے کہ اردو ادب کے نقادوں نے اردو افسانوں سے زیادہ دلچسپی نہیں لی اور دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں افسانوں اور ناولوں پر بہت کم توجہ دی گئی، انتظار صاحب نے اتفاق کیا۔ اس کی وجہ پوچھے جانے پر کہا کہ "ہم غزل کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ شاعری تو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ فوجی جنرلس ریٹائر ہونے کے بعد غزلیں کہتے ہیں۔ تاجروں اور سیاستدانوں کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ فکشن کا معاملہ مختلف ہے اس میں آدمی کو تھوڑا سا تردد کرنا پڑتا ہے، ریاضت کرنی پڑتی ہے وہ تھوڑی فکر اور سوچ کا تقاضا کرتی ہے۔ فکشن لکھا بھی کم جاتا ہے تو اس پر تنقید بھی کم ہوئی ہے۔ فکشن لکھنے کی طرح اس پر تنقید بھی اتنی آسان نہیں ہے۔"

ہمارا اگلا سوال یہ تھا کہ کیا ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد، تقریباً 1960 کے بعد افسانے سے کہانی رخصت ہوگئی تھی اور یہ صورت حال پندرہ بیس سال برقرار رہی؟ اپنے جواب میں انتظار صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں حقیقت نگاری کا دور بڑا لمبا چلا ہے۔ پریم چند سے اس کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ پریم چند کے آخری زمانے میں ترقی پسندی کا آغاز ہوچکا تھا۔ حقیقت پسندی کو نیا رنگ دے کر اسے مارکسی حقیقت پسندی کا نام دے دیا گیا گویا حقیقت پسندی پر مارکسزم کا نکھار لگا دیا گیا۔ یہ حقیقت نگاری خاصے عرصے چلی۔ اس کے ساتھ اسی دہائی میں وہ افسانہ بھی لکھا گیا جسے ہم داخلی حقیقت نگاری کہہ سکتے ہیں یعنی آدمی کے اندر جو کچھ گزر رہا ہے، اسے حقیقی انداز میں بیان کیا جائے۔ 1950 کی دہائی جب ختم ہونے لگی تو اس کے خلاف ایک ردعمل پیدا ہوا اور یہ کوشش کی جانے لگی کہ اظہار کے لیے کوئی نیا انداز کوئی نئی راہ تلاش کی جائے۔ اس طرح علامتی کہانی وجود میں آئی۔ یہ ایک تجربہ تھا اور جب تجربہ ہوتا ہے تو بہت سی بے معنی تحریریں بامعنی تحریروں کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔ آزاد نظم کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ بہت سی بے معنی نظمیں لکھی گئی تھیں، یہاں تک ہوا کہ میراجی جیسے شاعر پر ٹھپہ لگا دیا گیا کہ ان کی شاعری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جب تجربے ہوتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب جو تجریدی وعلامتی کہانی وجود میں آئی تو اس کی تکنیک ایسی تھی کہ حقیقت نگاری والی کہانیوں کی طرح اس میں کہانی بیان نہیں ہوسکتی تھی تو اس میں کہانی کا عنصر ختم ہوگیا، کہانی کی شکل بدل گئی۔"

1960 تا 1980 کے دور میں افسانے کی مقبولیت گھٹ جانے کے ذکر پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ نئے افسانے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ نئی شاعری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ "میں مشاعروں والی شاعری یا غزل کی بات نہیں کررہا ہوں، غزل کی مقبولیت تو مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے، میں صرف نئی شاعری کی بات کررہا ہوں، اس معاملے میں افسانے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ نئی شاعری کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ ادب سے لوگوں کی دلچسپی کا کم ہونا بھی ہے۔ پاکستان میں تو یہ ہوا کہ سنجیدہ سرگرمیوں سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوگئی۔ پورا قومی مزاج اس طرز کا ہوگیا کہ علمی سرگرمیوں میں لوگوں کی دلچسپی کم ہوگئی اور اس کے نتیجے میں ہماری قوم کا جو حال ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اسی طرح ادب سے بھی دلچسپی نہیں رہی تو ادب کی مقبولیت گھٹ گئی۔" انتظار صاحب نے مزید کہا کہ "اس دور میں لکھے گئے تجریدی، تمثیلی اور علامتی افسانوں میں خاصی تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن کی ادب میں اہمیت اور ایک حیثیت ہے۔ نیر مسعود (ہندوستان) کے افسانے ایسے ہیں جنھیں تمثیلی علامتی اور تجریدی افسانوں یا اسلوب کا معیار مانا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سریندر پرکاش کا ذکر آپ نے کیا وہ بھی عمدہ کہانیاں لکھتے ہیں۔ اور بھی لوگ ہیں جنھوں نے اس دور میں قابل قدر کام کیا ہے۔" اس کے بعد انتظار صاحب نے افسانے میں کردار، مکالمے، پلاٹ، واقعے اور کہانی پن کی ضرورت سے اتفاق تو کیا لیکن کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی تکنیک، اسلوب اور انداز پہلے کی کہانی کی طرح ہو، ان کے لیے علامتوں کا بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

علامتوں کے استعمال پر ہم نے مرحوم وحید اختر کی رائے انتظار حسین صاحب کو سنائی جس میں واقعے کی جگہ علامتوں کا تانا بانا لینے کی صورت میں افسانے سے کہانی پن غائب ہونے کی بات کہی گئی تھی۔ اس سلسلے میں موصوف کا خیال یہ تھا کہ مختلف کہانی نگاروں کی کہانیوں کے لیے اسے ایک کلیے کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ بعض لوگوں کے افسانوں میں کہانی ایسے غائب ہوئی جیسے کہ کہانی میں نئی نظم لکھی جارہی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسا افسانہ پسند نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے علامتی افسانہ پسند نہیں۔ کسی افسانے میں علامتوں کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی بات نکلی تو انتظار صاحب نے سوال کیا کہ علامتوں کے ضرورت سے زیادہ استعمال سے کیا مراد ہے؟" کوئی کہانی کار اگر اپنے تجربے کو علامتی رنگ میں سوچ کر اس کے مطابق کہانی لکھے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا وہ علامت کوئی

معنی دے رہی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کا استعمال مہمل ہے۔ علامت کا استعمال ضرورت سے کم یا زیادہ نہیں بلکہ درست یا مہمل اور بامعنی یا بے معنی ہوسکتا ہے۔"

پاکستان کے ادبی ماحول پر مختلف سوالات کے جواب میں انتظار صاحب نے ماضی اور حال میں پاکستان کے ادبی احوال کا بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ پاکستان گئے تھے تب کے اور آج کے ادبی ماحول میں بڑا فرق ہے۔ "اس وقت لکھنے والوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں ادب سے گہری وابستگی تھی۔ تخلیقی کام پوری تہذیبی دلچسپی سے کیا جاتا تھا۔ ادب کا عام قاری بھی ادب سے گہرا شغف رکھتا تھا۔ عوام بھی ادبی تحریروں کو اہمیت دیتے تھے۔ تب ادبی کام اپنے آپ کو تج کر اپنی ذات کو اس کے لیے وقف کر کے ایک مشن سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں، ہر چیز میں تجارتی و کاروباری ذہنیت آگئی ہے، میڈیا کی چکاچوند ہے۔ اس فرق میں کچھ سیاست کا بھی اثر ہے۔ اب مختلف قسم کے مفادات کو ادب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تخلیقی کاموں سے پہلے جیسی وابستگی نہیں رہی۔ اسی طرح ہندوستان پاکستان کے ادبی ماحول میں مشابہت بھی تھی اور فرق بھی تھا لیکن فرق بہت زیادہ نہ تھا۔ ہاں سیاسی سطح پر فرق خاصہ تھا لیکن ادب پر اس کا اثر کم تھا۔ فرق ادب کے لحاظ سے رفتہ رفتہ پیدا ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی دو ادبی برادریاں نہیں بنی تھیں۔ ادیبوں میں ایک دوسرے کو دوسرے ملک کا شہری سمجھنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ کسی بھی ادیب مثلاً کرشن چندر کی تائید یا مخالفت اسی طرح ہوتی تھی جیسے تقسیم سے قبل کی جاتی تھی۔"

پاکستان میں اردو کے مستقبل کے تعلق سے گفتگو شروع ہوئی تو انتظار حسین نے سب سے پہلے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ "پاکستان میں اردو کی علاقائی زبانوں سے کوئی رقابت نہیں ہے۔ اس رقابت کی حقیت کچھ نہیں ہے مفروضے زیادہ ہیں۔ بس تصور کرلیا گیا ہے کہ ایسا ہے جو درحقیقت نہیں ہے۔ علاقائی زبانوں میں ان کی ترقی اور فروغ کی تحریکیں کام کررہی ہیں۔ ہر تحریک میں کچھ انتہا پسند ہوتے ہیں لیکن اردو کا مقام وموقف قومی زبان ہونے کی وجہ سے اتنا مستحکم نہیں ہے جتنا اس وجہ سے ہے کہ یہ مختلف زبانیں بولنے والوں کے لیے رابطے کی زبان ہے۔ ایک طرح سے یہ پاکستان کی ایک تاریخی وسیاسی ضرورت کو پورا کررہی ہے۔ اسے نظرانداز یا فراموش کرنا بہت مشکل ہے۔ علاقائی زبانوں سے پاکستان میں اردو کو کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تصادم ہے۔"

اردو کی نئی بستیوں کو لندن، جدہ، دوبئی اور شکاگو وغیرہ میں اردو کے مستقبل کی بات نکلی تو انتظار صاحب نے کہا کہ اردو کی نئی بستیاں مت کہیے شاعروں کی نئی بستیاں کہہ لیجیے۔

ہندوستان میں اردو کا ماحول پہلے سے بہتر نظر آنے کی بات انتظار صاحب نے بڑے اعتماد سے کہی۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 1947 کے بعد کا جو فوری زمانہ ہے اور اس کے بعد 30-25 سال تک کا عرصہ اس زمانے میں اردو غریب تقسیم کے تعصبات کی زد میں آگئی تھی اور اسے مسلم لیگ، تحریک پاکستان سے پھر پاکستان سے منسلک کردیا گیا تھا۔ بھلے ہی مسلم لیگ یا پاکستان میں اسے مسلمانوں میں زیادہ بولے جانے یا اظہار کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اپنایا گیا ہو لیکن زبان تو اپنی جگہ ہے اور رہے گی۔

اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی کے بارے میں انتظار صاحب نے کہا کہ "آپ کے (ہندوستان) کے تعلیمی نظام میں یہ کوشش کی گئی کہ اسے اسکولوں میں پڑھایا جائے۔ یہ تعصبات شروع سے ہیں اسی وجہ سے اردو رسم الخط سے ناآشنائی بڑھ گئی۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کے خاتمے کے ساتھ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ خود اردو والوں نے اردو کے تئیں اپنی ذمے داری پوری نہیں کی۔ اردو والوں نے گھر پر بچوں کو اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ انتظار صاحب نے کہا کہ زندہ قومیں اس طرح جیتی ہیں جیسے یہودیوں نے اپنی زبان، عبرانی، کو مرنے نہیں دیا۔ صدیوں کا عرصہ انھوں نے محکومی میں گزارا۔ ان کا کوئی ملک نہ تھا لیکن جب جائز یا ناجائز طریقوں سے نئی مملکت اسرائیل نے حاصل کر لی تو تو وہاں عبرانی کو رائج کردیا۔ انتظار صاحب نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ اس عبارت کو نمایاں کردیں۔

پاکستان میں اردو زبان میں غیر ضروری طور پر اردو الفاظ کی جگہ انگریزی الفاظ کے استعمال کے رجحان کی بابت انتظار صاحب نے کہا کہ "یہ رجحان اردو زبان کے لیے ہی خطرہ نہیں ہے بلکہ پاکستانی قوم کے لیے بھی خطرہ ہے۔ ایسا صرف پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی اور صرف اردو کے ساتھ نہیں بلکہ ہندی کے ساتھ بھی ہورہا ہے۔ پاکستان میں یہ رجحان میڈیا، الیکٹرانک اور پرنٹ دونوں اور تجارتی رسالوں، ٹی وی ڈراموں، ڈائجسٹوں میں زیادہ ہے۔ یہ سب میڈیا کے زمرے میں آتے ہیں لیکن یہ رجحان ادب، شاعری، ادبی رسائل اور کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اس رجحان کے تدارک کے لیے بھی پاکستان میں کچھ نہیں ہورہا ہے۔" انھوں نے انگریزی کے اس غلبے کی ایک وجہ مغرب پرستی اور مغرب سے مرعوبیت کو بھی ٹھہرایا۔ تاہم انتظار صاحب نے کہا کہ جب تک علمی و ادبی کاموں میں یہ رجحان نہ پیدا ہو زبان و ادب کو اس سے خطرہ کم ہے۔

پاکستان میں اخبارات، رسائل اور کتابوں کی اشاعت اور فروخت کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے انتظار حسین صاحب نے بتایا کہ اخبارات اور عام رسالے تو خوب ہوتے ہیں لیکن سنجیدہ موضوعات پر علمی ادبی اور مذہبی کتب بھی کم بکتی ہیں جبکہ سیاسی موضوعات اور عام قسم کی مذہبی کتابیں خوب بکتی ہیں۔ علم و ادب کی سنجیدہ کتابوں کی اشاعت میں کمی کی وجہ یہی ہے کہ سنجیدہ قسم

کے علمی و ادبی کاموں میں لوگوں کی دلچسپی عموماً گھٹ گئی ہے۔ علم و ادب کے تعلق سے سماج کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔

پاکستان میں تعلیم اور خاص طور پر تعلیمی اداروں میں اردو زبان و ادب کے تعلیمی معیار کے بارے میں اظہار خیال سے انھوں نے یہ کہہ کر اجتناب کرنا چاہا کہ میں تعلیم کا آدمی نہیں ہوں تاہم ہمارے اصرار پر کہا کہ ''انگریزی دور حکومت میں تعلیمی نظام ایسا تھا کہ اس میں ادبیات پر خاصہ زور تھا، آرٹس کی اہمیت زیادہ تھی، طالب علم کی بھی یہ فکر ہوتی تھی کہ وہ ادب سے ایم. اے. کرلے تو وہ ادب کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے گا۔ صرف اردو ادب ہی نہیں دوسری زبانوں کا ادب خاص طور پر انگریزی ادب پڑھنے کا رجحان زیادہ تھا لیکن آج کا طالب علم سوچتا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کروں جس سے روزی کمانے میں زیادہ آسانی ہو۔ اس لیے ٹیکنکل تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ادب پڑھنے کا رجحان گھٹ گیا ہے۔ اسی طرح انگریزی کا بھی وہ معیار نہیں ہے جو پہلے تھا کیونکہ سارا زور ٹیکنالوجی پر ہے۔ ٹیکنالوجی کے طالب علم کو شیکسپیئر سے غرض نہیں ہے۔ اسی طرح پی. ایچ. ڈی. کے لیے بھی ریسرچ کا معیار گھٹ گیا ہے۔ پی. ایچ. ڈی. کو ملازمت میں ترقی ملتی ہے اس لیے جو ایم. اے. کرتا ہے وہ پی. ایچ. ڈی. بھی کرتا ہے اس طرح ریسرچ کرنا عام ہوگیا۔ اس کے اس قدر پھیلنے سے ریسرچ کا معیار بھی گھٹ گیا ہے۔ اسی طرح اب اس مقام و مرتبے کے استاد بھی بہت کم ہیں جس مقام و مرتبے کے استاد ہمارے زمانۂ طالب علمی، 1947 سے قبل یا اس کے بعد ہوا کرتے تھے۔ جب استاد ہی پہلے جیسے نہیں رہے تو تعلیم اور طالب علم پہلے کی طرح کہاں رہیں گے؟ یوں اچھے طالب علم اب بھی موجود ہیں لیکن عام معیار خاص طور پر اردو کے سلسلے میں بہت گر گیا ہے۔'' تاہم انتظار صاحب نے بتایا کہ پاکستانی جامعات میں پی. ایچ. ڈی. کرنے کروانے میں کرپشن کا رجحان نہیں ہے۔

پاکستان میں نئے لکھنے والوں کے بارے میں ہمارے سوالات کے جواب میں انتظار صاحب نے چند نام لیے۔ انھوں نے کہا کہ شاعرہ ہونے کے باوجود فہمیدہ ریاض نے بڑا اچھا فکشن لکھا ہے۔ اسی طرح فکشن لکھنے والوں میں آصف فرخی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بعض خواتین بڑی اچھی شاعری کررہی ہیں۔ حقوق نسواں یا Feminism کے حوالے سے متاثر ہوکر فہمیدہ ریاض، شاہدہ حسن، کشور ناہید اور فاطمہ حسن وغیرہ بڑی اچھی شاعری کررہی ہیں۔ نقادوں کے بارے میں انھوں نے کہا کہ محمد حسن عسکری کے وہ بہت قائل ہیں، فراق گورکھپوری بھی اچھے نقاد تھے۔ ''آج کے نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے مقابلے میں آپ کے پاس اچھے نقاد ہیں۔ پاکستان میں سہیل احمد خاں کا نام قابل ذکر ہے، انھوں نے بڑی اچھی تنقید لکھی ہے لیکن وہ کم لکھتے ہیں۔ ان کی تنقید بڑی اچھی ہے اور داستانوں پر اچھا کام کیا ہے۔ شاعروں میں انتظار صاحب نے احمد مشتاق، ظفر اقبال اور افتخار عارف کے نام پسندیدگی سے لیے۔ ہندوستانی شاعروں میں انھوں نے شہریار اور محمد علوی کے نام لیے۔ نقادوں میں وارث علوی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب کسی لکھنے والے کے بخیے ادھیڑنے ہوں تو ان کا تنقیدی شعور خوب بیدار ہوتا ہے اور قلم خوب چلتا ہے۔

گروپ بندیوں کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ گروپ بندیاں ہر دور میں ہر جگہ رہی ہیں، پاکستان میں بھی ہیں۔ تاہم انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں یہ کچھ زیادہ ہوگیا ہے۔ آخر لڑنا بھی ایک ضرورت ہے ادیب اگر لڑے گا تو اپنے ہم عصر ہی سے لڑے گا۔

□□□

پتہ:
Flat-207, Jahandar Towers
Rethi Bowli, Mehdipatnam
Hyderabad-500028 (A.P.)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت: -/228 روپے

خواجہ غلام السیدین

(ہماری مطبوعات سے)

قوموں کی تقدیر

اگر ہم تاریخ کی ورق گردانی کریں تو بار بار یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں، عروج حاصل کرتی ہیں۔ تمدن کے سرمائے میں کچھ اضافہ کرتی ہیں، پھر رفتہ رفتہ ان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف ان کا افسانہ عبرت تاریخ کے صفحوں میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ کیا یہ بھی انسان کے مرنے جینے اور سورج کے نکلنے ڈوبنے کی طرح ایک اٹل اور ناگزیر فطری حادثہ ہے جس میں انسان کے دست قدرت کو کوئی دخل نہیں، یا اس میں کسی سماجی اور اخلاقی قانون کی کارفرمائی ہے۔ میرے خیال میں قوموں کے عروج و زوال کو کسی بیرونی طاقت کا تابع قرار دینا نافہمی کا ثبوت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قومیں خود اپنے عمل سے اپنا حال اور مستقبل بناتی ہیں اور اپنی ہی بداعمالیوں سے تباہ ہوتی ہیں۔ قدرت کا قانون تو انصاف پر مبنی ہے۔ وہ نہ کسی قوم پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی بے جا ناز برداری۔ قرآن شریف کے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے: "خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی اندرونی صلاحیتوں کو تبدیل نہ کرے۔" حالی نے اس نکتہ کو اپنی مسدس میں یوں بیان کیا ہے:

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے
دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے

لہٰذا مسئلے کی یہ صورت بن جاتی ہے کہ قوموں کے لیے نیک عملی اور بدعملی کے معیار کیا ہیں؟ کون سے اسباب ہیں جو ان کی زندگی میں قوت اور حسن پیدا کرتے ہیں اور کون سے، کمزوری بداخلاقی اور زوال کی طرف لے جاتے ہیں؟ قدرت نے افراد اور جماعتوں کو مختلف قسم کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی قوتیں اور مادی وسائل عطا کیے ہیں اور کامیابی کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ ان کو ضائع نہ کریں بلکہ ایک قیمتی امانت سمجھ کر ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ مذہب کی اصطلاح میں کسی نعمت کے مناسب استعمال کو "شکر" کہتے ہیں۔ جو قومیں شکر کا فرض ادا کرتی ہیں اور اپنی دولت، علم اور وقت کو کفایت اور معقولیت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں ان کی قوتیں فروغ پاتی ہیں اور دنیا میں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے جو قومیں ان نعمتوں کا غلط استعمال کرتی ہیں ان کی قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہی مکافات عمل یا جزا اور سزا کا قانون ہے۔ "اگر تم شکر کروگے تو تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا لیکن کفران نعمت کروگے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔" مگر یہ عذاب خدا کی طرف سے براہ راست نازل نہیں ہوتا۔ قوانین قدرت کا نتیجہ ہوتا ہے جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح چپ چاپ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ قومیں جو بظاہر خوش حال اور طاقت ور معلوم ہوتی ہیں، دفعتاً قانون کی زبردست پکڑ میں آکر خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس تعزیر میں دیر لگ سکتی ہے مگر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ جوں جوں کسی قوم میں جد و جہد، فکر و عمل اور سعی و طلب کی صلاحیت کم ہوتی ہے، اس کے عبرتناک انجام کا سایہ بڑھنا اور پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم میں حیات صالح کی بنیاد ڈالنے کے لیے کیا شرائط ضروری ہیں۔ میرے خیال میں قومی ترقی کے لیے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قومی زندگی کی بنیاد سماجی انصاف کے اصولوں پر رکھی جائے۔ اس بنیادی صفت کے بغیر اور تمام کمالات بے کار ہیں یا بے کار ہو جاتے ہیں۔ جس سماج میں انصاف نہیں ہوتا وہاں تلوار اور قلم، ادب اور آرٹ، دولت اور تجارت، قوت اور حکومت سب کو کوئی چیز اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک روز یہ ساری عمارت نیچے آپڑتی ہے۔ قدیم یونانیوں کی تہذیب جس میں علم اور آرٹ کی ہم آہنگی نے ایک خاص شان دلفریبی پیدا کردی تھی اور قدیم رومی تہذیب جو اپنی وسیع مملکت تدبیر اور سیاسی قوت پر نازاں تھی کیوں تباہ ہوئیں؟ اس لیے کہ ان میں تمام انسانوں کا بحیثیت انسان کے احترام نہ تھا اور ان کی دیدہ زیب سطح کے نیچے بے شمار ایسے غریبوں اور مظلوموں کی تاریک زندگیاں دبی ہوئی تھیں جو تہذیب کی روشنی اور عام انسانی حقوق دونوں سے سراسر محروم تھے۔ مگر مثالوں کے لیے ماضی میں جانے کی کیا

"آندھی میں چراغ" سے ماخوذ، مصنف: خواجہ غلام السیدین، صفحات. 376، قیمت: -/73

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ضرورت ہے؟ آج بھی مغربی تہذیب کی ناکامی کا عبرت انگیز نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے، وہاں ایک طرف سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی اور انسانی دماغ کی خلاقی نے انسان کی کام کرنے اور دولت پیدا کرنے کی صلاحیت کو سیکڑوں گنا بڑھا دیا ہے اور دوسری طرف سرمایہ داری کے مظالم اور انسان دشمنی کی بدولت بڑے بڑے گروہ بلکہ ملک کے ملک، مفلسی، جہالت اور بے کاری میں گرفتار ہیں۔ انسان کے پاس آج ایسے علمی اور مادی وسائل موجود ہیں جن کی مدد سے وہ غربت اور بے کاری کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ بیماریوں کا انسداد کرسکتا ہے۔ لوگوں کے لیے رہنے کو مکان، پہننے کو کپڑا، پڑھنے کو کتابیں مہیا کرسکتا ہے لیکن چونکہ سماجی رشتوں میں انصاف کی کارفرمائی نہیں اس لیے سائنس کی ترقی بڑی حد تک بے کار اور خوش حالی اور امن و امان مفقود ہیں۔ اسی صنعت و حرفت کی ترقی اور نقل و حرکت کی آسانی اور تیزی کی وجہ سے قوموں میں باہمی وابستگی اور انحصار کلی کا ایک نیا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ ان حالات میں دولت اور دوسرے مادّی اور تہذیبی وسائل کی مناسب تقسیم نہ صرف انصاف اور اخلاق کی رو سے ضروری ہو جاتی ہے بلکہ عملاً بھی اس کے بغیر چارہ نہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب قوم کے تمام افراد میں ایکا ہو اور ان میں سے ہر ایک جماعت کی عزت میں اپنی عزت اور جماعت کی ذلت میں اپنی ذلت سمجھے اور نفسی نفسی کے بجائے انصاف کے اصول پر عمل کرے، ورنہ خودغرضی، تعصب اور نفاق کا دور دورہ ہو جاتا ہے جو زوال کا یقینی پیش خیمہ ہے۔

قومی ترقی کے لیے دوسری اہم شرط محنت، جفاکشی اور کسب حلال کی عادت ہے۔ افراد کی طرح جماعتوں کی صحت کے واسطے بھی حرکت اور جدوجہد ضروری ہے۔ جب کوئی قوم عمل اور جدوجہد کی زندگی سے جی چرانے لگتی ہے اور اس کے افراد عیش و عشرت یا گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کی قوتیں معطل ہو جاتی ہیں اور جسمانی اور ذہنی کاہلی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ لوگ کام کو عار سمجھنے لگتے ہیں اور محنت کرکے روزی کمانے کے بجائے پیری، مریدی، درویشی اور مجاوری کے پھیر میں پڑ جاتے ہیں یا رئیسوں کی مصاحبت اور درباداری اور خوشامد کے ذلیل پیشے کو اختیار کرلیتے ہیں۔ اس طرح ''مقدس گداگروں'' کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو کوئی عملی یا تخلیقی کام کرنے کے بجائے مختلف بہانوں سے خدا کے نام پر دوسروں کی کمائی بٹورتے ہیں۔ ان میں سوال کی عادت پیدا ہو جاتی ہے جو خودی اور خودداری کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ ان ناکردہ کار جماعت میں ان سب کے علاوہ وہ دولت مند طبقہ بھی شامل ہے جو بن کمائی دولت پر عیش کرتا ہے اور کسی شکل میں بھی جماعت کا قرض ادا نہیں کرتا۔ جوں جوں قوم میں ایسے تن آسان اور بے کار افراد کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے زوال کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ اسی لیے انصاف اور دانشمندانہ خودغرضی دونوں کا تقاضا ہے کہ قومی زندگی کی تنظیم میں سب سے مقدم جگہ ان بندگان خدا کو دی جائے جن کی محنت اور جفاکشی پر ہماری تہذیب و تمدن کا انحصار ہے اور گرمیٔ محفل کے لیے نہیں بلکہ درحقیقت سیاست کا اصول یہ ہو کہ جس کھیت سے خود محنت کش دہقان کو روزی میسر نہ ہو اس کے ہر دانۂ گندم کو جلا دیا جائے۔

یونان، مصر اور روم کی قدیم تہذیبیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ اٹھیں۔ ان کے زوال کا ایک سبب تو میں اوپر بیان کرچکا ہوں یعنی سماجی رشتوں میں انصاف کی کمی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ کچھ مدت تک قوت اور شوکت کی زندگی بسر کرنے کے بعد یہ قومیں کاہلی، عیش و عشرت اور بے کاری میں پڑ گئیں اور سعی و عمل کی گرمی کے بجائے ارباب نشاط کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت کے اٹل قانون نے کروٹ لی اور دیکھتے دیکھتے ان کی قوت اور عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا برمان کے متعلق ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام مجھے بہت پسند آیا تھا "A World That Works" (ایک ایسی دنیا جو کام کرتی ہے) دراصل یہ عنوان قوموں کی زندگی اور موت کے لیے ایک کسوٹی ہے، جو قومیں کام کریں گی زندہ رہیں گی جو کام سے جی چرائیں گی اور اس کو ایک بار سمجھ کر دوسری جماعتوں یا قوموں پر ڈالنے کی کوشش کریں گی وہ فنا ہو جائیں گی اور کم از کم میں ان پر آنسو بہانے کو تیار نہیں ہوں! کام تو زندگی کی قیمت ہے اور جو شخص یا جو جماعت اس قیمت کو ادا کرنے سے گریز کرتی ہے اس کی میرے دل میں اتنی ہی عزت ہے جس قدر کسی چور یا اچکے کی۔

جب انصاف، محنت، سادگی اور کفایت شعاری کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت کھڑی ہو جائے تو اس میں قوت، حسن و خوبی اور نظم و ترتیب پیدا کرنے کے لیے افراد و قوم میں تین صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرأت، رواداری اور ڈسپلن، جرأت زندگی کی علامت ہے۔ اس کی بدولت قوم میں حوصلہ اور مشکلات کو جھیلنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے خوف جو جرأت کی ضد ہے، زندگی کے پر قینچ کردیتا ہے۔ دوسری صفت رواداری ہے جس کے بغیر انفرادیت کی تکمیل ناممکن ہے اور قومی زندگی میں تنوع کی شان پیدا نہیں ہوسکتی۔ خدا کی دنیا میں یکسانیت نہیں اور اختلافات انسانی فطرت کا جز ہیں۔ اگر کسی قوم میں رواداری کا جذبہ نہ ہو تو یہ اختلافات مخالفت کی شکل اختیار کرلیتے ہیں اور ہر گروہ دوسروں پر زبردستی ایک خاص قسم کی یکسانیت عائد کرنا چاہتا ہے جو ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ڈسپلن اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی کام نظم و ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں ہوسکتا اور افراد اور جماعتوں میں خواہ مخواہ رسہ کشی ہوتی رہتی ہے جس میں ان کی قوت ضائع ہوتی ہے لیکن اصلی ڈسپلن وہ ہے جو کوئی بیرونی طاقت یا کوئی جابر حاکم قوم پر باہر سے عائد نہ کرے بلکہ وہ آزادی کی فضا میں خوش دلی کے ساتھ کام کرے اور اتحاد مقاصد کا نتیجہ ہو۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ ان سب صفات کی اہمیت تسلیم لیکن ان کی تربیت کیسے کی جائے۔ میرے خیال میں بڑے پیمانے پر قومی اور شخصی کیرکٹر کی تشکیل کے لیے چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جن میں سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی بڑا نصب العین ہو، جس کو بیشتر لوگ خوشی سے مانیں اور جوان کی تنظیم اور وحدت کے لیے ایک مرکز کا کام دے اور ان کے فکر وعمل پر حاوی ہوجائے۔ جب کبھی کسی قوم نے عروج حاصل کیا ہے ایسے ہی کسی آدرش نے اس کے لیے قوت محرکہ کا کام دیا ہے۔ مثلاً پرانے زمانے میں ہندوؤں کے سامنے معرفت حق کا نصب العین تھا یعنی اس ابدی اور ازلی حقیقت تک رسائی کی کوشش جس کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی حقیقت ایک پرچھائیں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ بدھ مت نے تہذیب نفس کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا۔ قدیم یونانیوں نے اپنی زندگی اور تہذیب میں خیر، حق اور حسن کے تصورات کو سمونے کی کوشش کی تھی۔ رومیوں نے انسانی تمدن کے سرمائے میں قانون، انصاف اور سیاسی امن کے تصورات کا اضافہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے سامنے انسانی وحدت، انصاف، اخوت اور مساوات کا نصب العین رکھا تھا اور تاریخ کے اس تاریک دور میں ایک شمع روشن کی تھی جس کی چھوٹ آج تک ہم پر پڑتی ہے لیکن ان تمام آدرشوں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ بعض خاص علمی، اخلاقی سماجی یا جمالی قدروں کے حامل ہیں... ورنہ محض دولت یا سیاسی طاقت پیدا کرلینا اور اس کے ذریعے دوسری قوموں کو غلام بنا کر خدا کی زمین میں فتنہ وفساد پیدا کرنا عظمت کی دلیل نہیں، حیوانیت کا ثبوت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یونانی سقراط، افلاطون اور ارسطو سے زیادہ سکندر پر فخر کرتے، چنگیز خاں کے وحشی مغل ہمارے احترام کے مستحق ہوتے اور ہٹلر کی جہانگیری کا جنون اور انگریزوں کی عالمگیر سلطنت کا قیام، گوئٹے اور شیکسپیئر، حافظ او رنیوٹن کے علمی اور ادبی کارناموں سے کہیں زیادہ قابل قدر شمار کیا جاتا!

لیکن محض ایک نصب العین کا تعین کافی نہیں کیونکہ عام لوگوں کے لیے کسی مجرد تصور میں کافی جاذبیت نہیں ہوتی۔ خواہ وہ قوت وشوکت کا ہو یا حسن وجمال کا یا انصاف اور خدمت کا۔ اس تصور کا حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کو ٹھیک وقت پر کوئی ایسا لیڈر میسر آجائے جس کی تمام زندگی اور عمل اس نصب العین کی تفسیر ہو، کیونکہ ایک سچے اور پرخلوص اور بے لوث انسان کی ذات ہی میں وہ کشش ہوتی ہے جو لاکھوں آدمیوں کے دل ودماغ میں انقلاب پیدا کرسکتی ہے:

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

اس کے فیض صحبت سے رفتہ رفتہ قوم میں ایسے مخلص کارکنوں کی ایک جماعت پیدا ہوجاتی ہے جو نیکی اور سچائی کو اپنا مقصد حیات بنالیتی ہیں۔ جاہ ومنصب کی رشوت اور دولت وقوت کا لالچ ان کی نیت میں خرابی اور ان کے قدم میں لغزش پیدا نہیں کرسکتے۔ تاریخ عالم میں آج تک کوئی سیاسی یا سماجی یا مذہبی تحریک کامیاب نہیں ہوئی اور نہ کسی قوم کو عروج حاصل ہوا جب تک اس میں کوئی ایثار پیشہ جماعت عوام کی بے غرض خدمت کے لیے کمربستہ نہ ہوئی ہو۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ ایسے ہی لوگوں کی برکت سے زمین اپنے محور پر قائم ہے، لیکن جب کسی قوم میں نیک اور بےنفس خدمت کرنے والوں کی جماعت باقی نہیں رہتی تو ان کا اخلاقی اور مادی زوال شروع ہوجاتا ہے یہاں تک قانون قدرت کے مطابق کوئی دوسری قوم ان کی جگہ لے لیتی ہے جس میں جدوجہد، خدمت خلق اور شکران نعمت کی بہتر صلاحیت ہوتی ہے۔ فطرت اکثر ایسی قوموں کو لمبی مہلت بھی دیتی ہے لیکن رفتہ رفتہ جب بداعمالیوں کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے جزائے عمل کا قانون دفعتاً ان کو پکڑ لیتا ہے جب کہ وہ غفلت میں سرشار ہوتے ہیں ''قوموں نے اپنے ہاتھوں سے جو کچھ کمایا تھا آج اس کی پاداش میں خشکی اور تری میں فتنہ وفساد برپا ہوگیا ہے تاکہ لوگ اپنے اعمال کا پھل چکھیں۔ شاید ان کو اس سے عبرت ہو اور وہ راہ راست کی طرف آجائیں۔'' (قرآن شریف)

ظاہر میں ہمارے زمانے کی موجودہ کشمکش میں قوت کی کشمکش معلوم ہوتی ہے یعنی جس قوم یا جن قوموں کے پاس زیادہ سامان جنگ اور دولت اور صنعت وحرفت کے وسائل ہوں گے وہ اس مقابلے میں کامیاب ہوں گی گویا کامیابی کا مطلب محض وسائل کی فراوانی یا جنگ کی کامیابی ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ بیسویں صدی میں ہتھیاروں کی جنگ میں کوئی قوم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس میں تو فاتح اور مفتوح دونوں کی ہار ہے اور دنیا کی تباہی۔ لہٰذا اگر مقابلہ اس محاذ پر ہوا تو ہار جیت کے الفاظ بے معنی ہوں گے لیکن اگر صورت حال کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلی مقابلہ قدروں کا مقابلہ ہے، اخلاقی اصولوں کا مقابلہ ہے۔ مقابلہ اسی میدان میں ہے (یا ہونا چاہیے) کہ کون سا نظام انسانوں کے لیے ایک بہتر اور بھرپور زندگی مہیا کرسکتا ہے جس میں انھیں اپنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ملے۔ اس نظام کی ترتیب میں دور حاضرہ کے جدید تقاضوں سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ دنیا کے حالات بہت تیزی کے ساتھ بدلے ہیں اور بدل رہے ہیں۔ اب لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کے بجائے منصوبہ بندی اور اجتماعیت کا دور دورہ ہے جس کے نقوش سوشلسٹ ملکوں میں بہت واضح اور نمایاں ہیں اور دوسرے ملکوں میں بھی رفتہ رفتہ ابھرتے جاتے ہیں۔ ہم ان مطالبات کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ تبدیلی اور انقلاب زندگی کی فطرت میں شامل ہیں۔ جس قوم یا جماعت میں انقلاب سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی وہ زندگی کی دوڑ میں مات کھاجاتی ہے اور بازار عالم میں اس کی حالت یہ ہوجاتی ہے:

یاں نکلے ہیں سودے کو درم لے کے پرانے
اور سکہ رواں ملک میں مدت سے نیا ہے!

لیکن اجتماعیت بھی بجائے خود ہر مرض کی دوا نہیں۔ اس میں بھی ظلم، حق تلفی، انسان دشمنی اور بے جا تصرف کی گنجائش ہے۔ نسلی غرور تحکم اور ملوکیت اس کو بھی مسخ کر سکتے ہیں۔ انصاف اور آزادی اور امن اس بت کی بھینٹ بھی چڑھائے جا سکتے ہیں۔ اصلی سوال یہ ہے کہ کون سی قوم یا قومیں اس نئے نصب العین کی روشنی میں سائنس اور صنعت و حرفت کی حیرت انگیز طاقتوں کو تمام بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے استعمال کریں گی؟ کیا ہندوستان ایسا کر سکے گا؟ کیا امریکہ میں اس کی صلاحیت ہوگی؟ کیا روس کی سماج سیوا اور سماجی مساوات کی کوشش شہنشاہیت کی لعنت سے محفوظ رہیں گی؟ کون کہہ سکتا ہے؟ وقت ہی اس کا جواب دے گا لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ قوموں اور افراد کی زندگی میں امن اور خوشی صرف اسی صورت میں راہ پا سکتی ہے جب وہ اخلاق اور شرافت کے بنیادی اصولوں کو برتنا سیکھیں۔ کوئی دوسری چیز بھی قوت ہو یا دولت یا سائنس، اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے لکھا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر!

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کے اقبال کا آغاز جد و جہد اور سعی و طلب سے ہوتا ہے اور اس کا انجام عیش و عشرت پر۔ البتہ اتنا یاد رکھیے کہ اقبال کی ''شمشیر و سناں'' میں خونریزی کی تلمیح نہیں، جفاکشی، سخت کوشی اور خدمت خلق کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے ان کے استعمال پر ایک بہت کڑی شرط عائد کی گئی ہے۔

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

یعنی اگر دولت اور ملک گیری کی ہوس میں تلوار اٹھائی جائے تو انشاء اللہ وہ تلوار خود ان کے سینے میں اتر جائے گی اور شاید اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ قوم طاؤس و رباب کے بے کار شغل ہی میں الجھی رہے!

□□□

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

احتشام الحق قریشی (ہماری مطبوعات سے)

حفظ صحت کا غذائی نظام

انسان کی حفظ صحت کے مسئلے کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا اس دنیا کا دائرہ وسیع ہے۔ علم حفظ صحت نے اب تک بہت کچھ ترقی کی ہے مگر ابھی منزل مقصود دور ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں دنیا کی ہر اس چیز کا علم حاصل ہوجائے جو بدن انسانی پر کسی حیثیت سے موثر ہوتی ہو۔ ہوا، غذا، پانی اور اسی نوعیت کی انسان کے قریبی ماحول کی چند چیزیں اگر چہ حفظ صحت کی اہم اور بنیادی چیزیں ہیں اور ان کے بارے میں جو معلومات فراہم ہوچکی ہیں وہ بھی انسان کی ذہنی ترقی کا شکار ہیں لیکن جو لوگ انسان اور دنیا کے مادی تعلق پر گہری نظر رکھتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ اب تک اس مسئلے پر جو کچھ کہا جاچکا ہے اس سے کہیں زیادہ کہنا ابھی باقی ہے۔

انسانی معلومات کا ہر شعبے میں حال یہ ہے کہ ان کا آغاز اپنے قریب ترین ماحول سے ہوتا ہے اور پھر زمانے کی رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلہ دور دور تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ علم حفظ صحت کا آغاز جن چیزوں سے ہوا ہے وہ انسان کے قریب ترین ماحول کی چیزیں ہیں جن سے انسان کا تعلق بہت گہرا اور مضبوط ہے۔ ان سے انسان کے تاثرات بہت نمایاں اور صاف ہیں اس لیے علم حفظ صحت کی فطری شروعات یہی چیزیں ہوسکتی تھیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس علم کا دائرہ ان چیزوں تک پھیلتا چلا گیا جن کے اثرات حفظ صحت کے نقطۂ نظر سے بدن انسانی پر محسوس کیے جاسکیں۔ قدیم اور جدید علم حفظان صحت میں فرق کی یہ بڑی وجہ ہے آئندہ جس رفتار سے معلومات میں اضافے کے مواقع آتے جائیں گے اتنا ہی اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔

علم حفظ صحت کی اس بے پایاں وسعت کے باوجود کوئی نہیں جو اس واقعیت کے انکار پر آمادہ ہوسکے کہ مسئلہ غذائیت کے تعلق کی جو نوعیت اس علم سے ہے اس میں کوئی دوسری چیز اس کی شریک نہیں اور عقل سلیم ورائے صحیح اس امکان پر کسی درجہ میں یقین نہیں رکھتی کہ زمانے کی کوئی گردش ایسی بھی ہوسکتی ہے جس میں حفظ صحت کے نقطۂ نظر سے غذائیت سے اہم تر کسی چیز کا انکشاف ہوسکتا ہے۔ اس وجہ سے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مسئلہ ہمیشہ غور طلب رہا اور انھوں نے اس کی طلب کا جواب بہترین طریقے پر دیا۔ ان مساعی کے نتیجے میں مسئلہ غذائیت کے بہترین پہلو نمایاں ہوئے اور اس سلسلے کی درازی سے ہمیں توقع ہے کہ اس کے جو گوشے آئندہ ظاہر ہوں گے وہ اور زیادہ اہم ہوں گے۔

حفظ صحت کے لیے صحیح غذائی نظام کیا ہے؟ غذائیات کی بحث کا یہ اہم سوال ہے۔ اس جواب کے متعین کرنے میں قوانین فطرت سے مدد لی ہے، کیونکہ ہمارا کام بدن انسان کے بارے میں خود سوچ کر کوئی قانون بنانا نہیں ہے بلکہ ان قوانین کی جستجو اور تلاش ہمارا کام ہے جو اس کے لیے فطرتاً وضع کیے جاچکے ہیں۔ خالص عقلی حیثیت سے کوئی قانون ہر پہلو سے کیسا ہی مکمل اور موزوں کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ خلاف فطرت ہے تو بالکل غلط ہے۔

بدن انسان کے لیے صحیح نظام غذائی معلوم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان اغراض پر ایک نظر ڈالی جائے جن کو پورا کرنے کے لیے انسانوں کو غذا کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ تغذیہ کا صحیح نظام یہ جانے بغیر نہیں بن سکتا کہ وہ خاص ضرورت کے لیے ہے جس کے لیے ایک نظام غذائیت کی تشکیل کرنی ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ تغذیہ کا مقصد تحفظ صحت ہے لیکن مقصد تغذیہ کے اس علم کی بنیاد پر کوئی نظام تغذیہ بنانا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ساری غذائیں محافظ صحت ہیں اس کے سوا ان کا اور کوئی مصرف نہیں ہے اس لیے ضرورت ہے کہ تحفظ صحت کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے۔

بغور مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحفظ صحت کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ بدن انسان کے مادہ اور مزاج میں جو ہمہ وقتی تحلیل وتنقیص کا سلسلہ چل رہا ہے اس کے مقابلہ میں مادہ اور مزاج کے داخل ہونے کا سلسلہ بھی اسی رفتار سے چلتا رہے تاکہ بدن کے مادہ اور مزاج کا فطری توازن قائم رہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ناگزیر طور پر پیش آنے والے متعدد اسباب کے اثرات سے صحت میں جو خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں ان کی روک تھام کی جائے انھی دونوں اغراض کی تکمیل کا نام تحفظ صحت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے

"علاج بذریعہ غذا" سے ماخوذ، مصنف: حکیم احتشام الحق قریشی، صفحات 512، قیمت : -/90

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

لیے جو نظام غذائی ہوگا وہ آپ سے آپ دو حصوں میں تقسیم ہوگا ایک حصہ بدن انسان کی ہمہ وقتی تحلیل و تنقیص کی تلافی کرے گا اور دوسرا حصہ اس کو ناگزیر طور پر پیش آنے والے متعدد اسباب کے مضر اثرات سے محفوظ رکھے گا۔ ان دونوں اجزا میں سے جس جز کو بھی غذائی پروگرام سے بالکل خارج کردیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صحت محفوظ نہ رہے گی۔ صحت کا تحفظ پورے طور پر اسی طرح ممکن ہے کہ اس کا غذائی پروگرام ان دونوں اجزا سے مرکب ہو۔ ان ہر دو اجزا میں سے کسی جز کی حیثیت بھی علاج کی نہیں ہے کہ جب ضرورت ہو تو اس کو استعمال کرلیا جائے۔ بلکہ ہر چیز کی ضرورت ہر وقت یکساں ہے کیونکہ انسان فطری طور پر ہر وقت ان کا محتاج ہے۔ اب ہم غذائیات کی بحث کے اس اہم سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ حفظ صحت کا صحیح غذائی نظام کیا ہے؟

جس طرح تحفظ صحت کی دو قسمیں ہیں اسی طرح غذا کی بھی دو ہی قسمیں ہیں ایک غذائے مطلق، دوسری غذائے دوائی۔ یہ دونوں قسمیں مل کر تحفظ صحت کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ غذائے مطلق کا تعلق تحفظ صحت کی اس نوعیت سے ہے جو ہمہ وقتی تحلیل و تنقیص کی تلافی کے لیے ضروری ہے اور غذا دوائی تحفظ صحت کی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے جو ناگزیر طور پر آنے والے پیش اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔

غذائے مطلق بدن انسانی کی بنیادی غذا ہے۔ اس کا فائدہ بدن انسان کے لیے صرف بدل ما یتحلل کی فراہمی ہے یعنی یہ بدن انسان کی طبعی حالت برقرار رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدن انسانی ہر لحظہ گھٹتے رہنے کے باوجود گھٹتا نہیں ہے اور اس کی طبعی حالت برقرار رہتی ہے اس لیے یہ ہمہ وقتی تحلیل و تنقیص کی تلافی بالکل کافی ہے۔ لیکن اس میں ایسی کوئی قوت نہیں ہے جو ناگزیر طور پر پیش آنے والے اسباب کے نقصانات سے صحت کی حفاظت کرسکے۔ اس کی مثال ان اینٹوں کی طرح ہے جو کسی دیوار کی خالی جگہوں کو بھر کر اس کی صحیح حالت کو برقرار رکھتی ہے مگر بارش اور تصادمات سے دیوار کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے اس سے بچاؤ یہ اینٹیں کرسکیں۔ اس ضرورت کو پلاسٹر پورا کرسکتا ہے۔

غذائے مطلق بدن انسان کی جس ضرورت کو پورا کرتی ہے وہ نہ کسی وقت ختم ہونے والی ہے اور نہ اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی ہی ہوسکتی ہے۔ یہ ضرورت زندگی کی آخری سانس تک ایک ہی صورت میں باقی رہتی ہے۔ یہ پوری ہو ہوکر برابر پیدا ہوتی رہتی ہے اور موت سے پہلے وہ وقت کبھی نہیں آتا جب اپنی تکمیل کے آخری مرحلے پر پہنچ جاتی ہو۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے جو غذائیں ہوں گی وہ بنیادی ہوں گی کیونکہ انھیں بدن انسان کی بنیادی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ ان میں تغذیہ کی اتنی مقدار بھی ضروری ہوگی جتنی بدن انسان کے ما یتحلل کا بدل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ ان کا مزاج بھی اس درجے کا ہوگا جتنا بدن انسان کے مزاج کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ان خصوصیات کے بغیر کوئی غذا بدن انسانی کی اس بنیادی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتی اور اس میں شک نہیں کہ غذائے مطلق ان خصوصیات کی جامع ہے، پھر چونکہ یہ ضرورت عام ہے اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والی غذا دوسری قسم کی غذا سے بہت زائد مقدار میں پیدا ہونے والی ہو۔ ہر موسم میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ ہر ملک میں اس کا وجود ہوتا کہ بدن انسان کی یہ بنیادی ضرورت کسی وقت ادھوری نہ رہ جائے۔ جن غذاؤں پر غذائے مطلق کی تعریف صادق آتی ہے وہ سب کی سب ایسی ہیں جن کی پیدائش زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ وہ ہوا اور پانی کی طرح ہر جگہ ہر وقت انسان کے لیے حاضر ہیں اور انسان ہر جگہ ہر وقت ان کے قواعد سے مستفید ہو رہا ہے اور یہ ان کے بنیادی غذا ہونے کی زبردست فطری دلیل ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں میں یہ غذائیں مشترک ہیں۔ ہر ملک اور ہر موسم میں انسان ایک ہی نوعیت کی غذائیں استعمال کرتا ہے اس پہلو سے ان کے درمیان کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔

قانون حفظ صحت بالمثل پر بس اسی حد تک عمل کرنا صحیح ہے۔ دوسری صورت کے تحفظ صحت میں اس قانون میں سے کوئی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے بلکہ اس صورت میں تو یہ قانون بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہوگا۔ اس صورت کا قانون حفظ صحت بالضد ہے۔ وہی قانون جو علاج کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناگزیر طور پر پیش آنے والے اسباب سے بدن انسان پر جو مضر اثرات پڑ سکتے ہیں ان سے صحت کا تحفظ اسی طرح ممکن ہے کہ صحت کا مزاج، مزاج اسباب کی ضد ہو۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے بدن انسان کو ان اسباب کی مضرتوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت ناممکن ہے۔

ناگزیر طور پر پیش آنے والے اسباب کے دائرے میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو بدن انسان کی طبعی حالت میں کوئی تغیر پیدا کردیتی ہیں مثلاً موسمی تغیرات، مقامی تغیرات، عمری تغیرات وغیرہ۔ یہ تمام تغیرات انسان کے لیے بہرحال ناگزیر ہیں۔ کوئی انسان زندگی میں ان سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ اس لیے صحت پر ان کے جو نقصان رساں اثرات پڑتے ہیں ان سے تحفظ کی بھی اتنی ہی اہم ضرورت ہے جتنی بدل ما یتحلل کی۔ اگر بدل ما یتحلل کی ضرورت کے ساتھ اصلاح صحت کی ضرورت ہدوش نہ ہو تو صحت کے یہ نقصانات مرض کی شکل اختیار کرتے چلے جائیں گے اور بحیثیت مجموعی انسانی صحت ہمیشہ امراض سے مغلوب رہے گی۔ اس ضرورت کی تکمیل کا اصول چونکہ بالضد ہے اس لیے خیال ہوسکتا ہے کہ دوائے مطلق بھی تو اس کو پورا کرسکتی ہے؟ لیکن

چونکہ غذائے دوائی میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے دوائے مطلق بری ہے اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ غذائے دوائی خالص غذا کے مقابلے میں بدن انسان سے زیادہ قریب ہے۔ دوائے مطلق اور بدن انسان میں جیسی منافات ہے ویسی غذائے دوائی اور بدن انسان میں نہیں ہے۔

دوائے مطلق بالکل غیر طبعی چیز ہے مگر غذائے دوائی اپنی غذائیت کی وجہ سے ایک حد تک طبعی ہے اور اصولاً غیر طبعیات کا استعمال غیر طبعی حالات ہی میں موزوں ہے۔ اصلاح صحت کی ضرورت کوئی غیر طبعی حالت نہیں ہے اس لیے اس موقع پر غذائے دوائی قابل ترجیح ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خالص دوائیات کے ذریعے سے بدن انسان میں جو مزاج پہنچے گا وہ دیرپا نہیں ہوگا بلکہ خارج ہو جائے گا اور جب تک ٹھہرنے والا مزاج نہ ہو اس وقت تک اصلاح صحت کی غرض پوری نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اسباب کے تاثر کا وقت معین نہیں ہوتا، لہٰذا بدن میں ہمہ وقت اس کا مقابلہ کرنے والی قوت موجود رہتی ہے۔ غذائے دوائی کی وساطت سے بدن میں پہنچنے والا مزاج اس وقت تک بدن میں موجود رہتا ہے جس وقت تک اس سے پیدا شدہ اخلاط و اعضا بدن میں موجود رہتے ہیں۔ لہٰذا اصلاح صحت کے لیے غذائے دوائی ہی کارآمد ہے۔

تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ اغذیہ دوائیہ کا مقصد تخلیق ہی یہ ہے کہ تندرست بدن انسان کو بے اعتدالیوں سے محفوظ کیا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ ماحول کی ہر تبدیلی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ دوائی قسم کی چیزیں بھی قدرت پیدا فرما دیا کرتی ہے۔ قدرت کا یہ حسن انتظام اس بات کا نہایت ہی اہم ثبوت ہے کہ اصلاح صحت کے لیے قوت مدافعت کا ٹھیک ٹھیک جو درجہ اور مزاج ہونا چاہیے وہ غذائے دوائی کے اندر موجود ہے اور خالص ادویہ کے استعمال میں وہ تناسب اور توازن پیدا کرنا آسان نہیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ دوائیات سے انسان مانوس نہیں ہے۔ وہ جب تک محسوس حیثیت کا مریض نہ ہو اس وقت تک ان کے استعمال پر آمادہ نہیں ہوتا، اصلاح صحت میں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، جو استعمال ادویہ کی داعی ہو، پھر ہر موقع پر ادویہ کے انتخاب کے لیے جس علم کی ضرورت ہے وہ سب لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ادویہ کے استعمال کی پابندی بھی عام طور پر بار خاطر ہوگی۔

اغذیہ دوائیہ کے استعمال میں ان دشواریوں میں سے کوئی دشواری نہیں ہے۔ وہ ہر موقع کی مناسبت سے خود بخود ہمارے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے۔ ہماری طبیعت خود بخود ان کے استعمال کی طرف راغب ہو جاتی ہے اور جب تک ان کے استعمال کے ہم حاجت مند ہوتے ہیں تب ہی تک وہ دنیا میں موجود رہتی ہیں اور پھر خود بخود غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ اصلاح صحت کا بنایا پروگرام ہے اور انسان اس کے مطابق اپنے تغذیہ کا نظم قائم رکھنے پر فطرتاً مجبور ہے۔ اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اغذیہ دوائیہ عام طور سے لذیذ اور خوشگوار ہوتی ہیں۔ یہ لذت اور خوشگواری درحقیقت ان کے استعمال کے حق میں ایک زبردست سفارش ہے اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ انسان ان مفید اشیا کے استعمال سے بے اعتنائی نہ برتے بلکہ شوق و رغبت سے ان کی طرف مائل ہو اور ان میں غیر طبعی حیثیت کا جو ایک پہلو ہے وہ اس کے لیے باعث نفرت نہ ہو۔ مگر جن لوگوں کی نظر اغذیہ دوائیہ کے مقصد تخلیق پر نہیں پڑی ہے وہ ان کی طرف انسان کی فطرت کے جذب و کشش کو نظروں سے دیکھتے ہوئے بھی ان کی خوش ذوقی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور انسان کو اس سے علاحدہ رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان غذاؤں میں جو نقصانات ہیں درحقیقت انھی میں انسان کا مفاد مضمر ہے۔

ہماری علم الادویہ میں غذائیات دوائیہ کے اثرات کا جو بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر دہشت ناک ہے کہ اگر عام رواج کی پشت پناہی اور خود ہماری فطرت کا رجحان نہ ہو تو ہم ان جیسی چیزوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ ان کو سراسر مضر بتایا گیا ہے اور ٹھیک ٹھیک دوا مطلق کی طرح غذائے دوائی کا مصرف بھی صرف امراض کو بتایا گیا ہے۔ حالانکہ دوائیات خالصہ کے برخلاف غذائیات دوائیہ میں خاص طور پر اصلاح صحت کے اثرات ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے علم الادویہ میں ان کا تذکرہ ہونا چاہیے تھا اور مندرجۂ ذیل عنوانات کے ماتحت ان کے اثرات کی تشریح ہونی چاہیے تھی۔ ہر موسم کے جو مضر اثرات بدن انسان پر ہوتے ہیں ان سے تحفظ کے لیے اس موسم کی اغذیہ دوائیہ میں کیا اثرات ہیں؟ کس غذائے دوائی کی مضرت کی اصلاح کس غذائے دوائی سے ہے؟ ایک موسم میں پیدا ہونے والی اغذیہ دوائیہ کی جداگانہ خصوصیات اور ان کی بنا پر ہر مزاج کے بدن انسان سے اس کے تعلق کی نوعیت! وہ اغذیہ دوائیہ جو مضر ہی معلوم ہوئی ہیں کیا ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ غلط طریقۂ استعمال اور اس کے نتائج کی نشاندہی متحدالمزاج اغذیہ دوائیہ کے باہمی امتیازات، مختلف مزاجوں میں اغذیہ دوائیہ کے استعمالات کا تعین وغیرہ۔

اس طرح کے عنوانات پر جو کتاب الاغذیہ مرتب ہوگی اس کے مطالعے سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ بہت سی وہ چیزیں جو ناقابل اعتنا خیال کی جاتی ہیں وہ درحقیقت نہایت ہی بیش قیمت فوائد کا تحفہ لے کر انسانوں کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور خدمت کرنے کے موقعے کا انتظار کرتے کرتے حسرت و افسوس کے ساتھ واپس ہو جاتی ہیں۔ پھوٹ، کھیرا، سنگھاڑا، شکرقند، بڑہل، کٹھل، بیر، نارنگی، بیگن، کروندہ، کمرکھ، سیندھا، بھٹے، کیتھ دنیا میں اس

قدر بدنام ہیں کہ ان کے نام سے سنجیدہ لبوں پر بھی مسکراہٹ آجاتی ہے لیکن اگر سنجیدہ مسکراہٹ کے بجائے ان چیزوں کی سنجیدہ کاوش و تحقیق کی جائے تو ثابت ہوگا کہ بدن انسان کے لیے بحیثیت مجموعی یہ بھی اہم غذاؤں کی طرح ضروری ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ حفظ صحت کا نظام غذائی، غذائے مطلق اور غذائے دوائی سے مرکب ہوتا ہے دونوں کی اہمیت یکساں ہے اس نظام سے کسی ایک جز کو اگر خارج کردیا جائے گا تو صحت کا تحفظ نہیں ہو سکے گا۔ غذائے مطلق ایک ہی شکل میں ہمیشہ استعمال ہونی ضروری ہے کیونکہ اس کے استعمال کی ضرورت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ غذائے دوائی موقع کی مناسبت کے لحاظ سے مختلف اشکال میں استعمال ہونی ضروری ہے کیونکہ اس کے استعمال کی ضرورت بدلتی رہتی ہے۔ موسموں کے اختلاف سے غذائے دوائی میں جو اختلاف پیدائش ہے یہ اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔ اس مثال پر غور کرنے سے وہ اصول معلوم ہوسکتا ہے جو غذائے دوائی کے انتخاب کے لیے ناگزیر ہے۔

حفظ صحت کے نظام غذائی پر یہ خالص اصولی اور بنیادی گفتگو ہے۔ اس کے بعد اس مسئلے پر تفصیلی اور جزئیاتی بحث کا مرحلہ ہے مگر فی الحال اس مرحلے میں قدم رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ہاں اغذیہ دوائیہ کے سلسلے میں دو باتیں ضرور قابل ذکر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ چونکہ ہر دوائے غذائی کی مقدار پیدائش یکساں نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہر غذائے دوائی کی مقدار استعمال اس کی مقدار پیدائش کے مطابق ہونی چاہیے۔ جو چیز جتنی زیادہ پیدا ہوتی ہے اس کا استعمال زائد ہونا چاہیے اور جو چیز کم پیدا ہوتی ہے اس کا استعمال کم ہونا چاہیے۔ اس تناسب کے خلاف اغذیہ دوائیہ کا استعمال بدن انسان کی صحیح ضرورت کے خلاف ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی غذاؤں کی جتنی مقدار استعمال کا ایک شخص عادی ہو۔ وہ جب کسی غذائے دوائی کو استعمال کرے تو اس بنیادی غذا کی مقدار استعمال میں مناسب کمی کردینی چاہیے۔ خصوصیت سے پھلوں کے استعمال میں یہ غلطی کی جاتی ہے کہ ان کے ساتھ بنیادی غذا بھی پوری مقدار میں استعمال کرائی جاتی ہے۔ یہ وہ غلطی ہے جو انسان کو پورے طور پر اغذیہ دوائیہ کے فوائد سے مستفیض نہیں ہونے دیتی۔

اس موقع پر بعض اغذیہ دوائیہ کے استحالہ بخلط غالب کا مسئلہ بالا جمال زیر بحث آجانا چاہیے کیونکہ یہ بھی اغذیہ دوائیہ کے استعمال کے قوی مانع ہے۔ بعض اغذیہ دوائیہ میں استحالہ بخلط غالب کا نقص حقیقت میں نقص نہیں ہے بلکہ یہ ایک فائدہ ہے جو نقصان کی صورت میں انسان کو حاصل ہوتا ہے لیکن یہ نقصان یا فائدہ صرف انھی ابدان میں پیدا ہوتا ہے جن میں کوئی خلط یا غالب موجود ہو۔ اغذیہ دوائیہ بہر حال مستحیل بخلط غالب نہیں ہوتیں اور حفظ صحت کا غذائی نظام ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو مریض ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قانون حفظ صحت بالمثل کو سمجھنے والوں نے اس لیے غلط سمجھا کہ ان کے سامنے حفظ صحت اور اصلاح صحت کا فرق واضح نہیں تھا۔ انھوں نے دونوں باتوں کو ایک سمجھا اور اصلاح صحت کی مثالوں سے حفظ صحت کے قانون پر اعتراض کیا۔ اس خلط مبحث کا یہ نتیجہ ہے کہ متعدد جوابات کے باوجود بات بننے کے باوجود الجھتی چلی گئی ہے۔ محرورین کے لیے رمانیہ اور اجاصیہ کے استعمال کی ضرورت اور مبردین کے لیے اغذیہ حارہ کا استعمال اور اسی نوعیت کے دیگر شکوک سے قانون صحت بالمثل کو جو مجروح کیا گیا ہے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ان باتوں کا تعلق حفظ صحت سے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ اس کے دائرۂ قانون سے خارج کی جاتی ہیں یہ باتیں تو درحقیقت اصلاح صحت کے قانون کے ماتحت ہیں اور یہ قانون بالضد ہے۔ اس موقع پر ہمیں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ خود متقدمین کے لٹریچر میں حفظ صحت اور اصلاح صحت کے جداگانہ اصولوں کی طرف واضح اشارہ موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ابن ابی صادق نے قانون حفظ صحت بالمثل پر اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اس میں ٹھیک ٹھیک معتدل مزاج کے انسان کے لیے قانون اصلاح صحت کی ضرورت تسلیم نہیں کی ہے اور اس انداز سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے ان کے نزدیک حفظ صحت کا غذائی نظام صرف اغذیہ مطلقہ پر ہی منحصر ہے۔ قانون حفظ صحت بالمثل کے بارے میں معترض کی غلط فہمی کی بنیاد یہی ہے۔

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

اردو خبر نامہ

مخدوم محی الدین پر سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 8رجنوری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سہ روزہ سیمینار "مخدوم محی الدین — حیات اور کارنامے" کا افتتاح انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں جناب اے. بی. بردھن (جنرل سکریٹری، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا) نے کیا۔ اس افتتاحی جلسے کی صدارت جناب حبیب تنویر نے کی اور اس میں جناب پی. شیوشنکر، جناب جی. وینکٹ سوامی اور جناب سدھاکر ریڈی نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ہم اس پروگرام کے ذریعے مخدوم محی الدین پر صد سالہ جشن کی شروعات کر رہے ہیں آپ سب جانتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی رہنما کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ لیکن مخدوم ایسے شاعر اور سیاست داں تھے جن کی سیاسی اور ادبی زندگی میں کوئی تضاد نہ تھا۔ اکثر ترقی پسند شاعروں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ نعرہ بازی کی شاعری کرتے رہے ہیں لیکن مخدوم نے جو شاعری کی اس میں نغمگی بھی ہے اور انسان دوستی کا جذبہ بھی انھوں نے کہیں بھی شاعری کے معیار کو پست نہیں ہونے دیا۔ اسی شاعر کو یاد کرتے ہوئے ہم نے آپ لوگوں کو زحمت دی ہے۔ جناب اے. بی. بردھن نے مخدوم محی الدین کی ادبی و سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم محی الدین کی اصل شناخت شاعر کی حیثیت سے ہے اور وہ اردو کے بے حد اہم شاعر ہیں۔

جناب اے. بی. بردھن نے مخدوم کی کئی نظموں کے بند پڑھے اور مخدوم کی سیاسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا رشتہ ان کی تخلیقی کائنات سے جوڑنے پر زور دیا۔

انھوں نے قومی اردو کونسل کو مبارکباد پیش کی کہ "اس نے اردو کے اس عظیم شاعر اور مرد مجاہد کی یاد میں سیمینار کا انعقاد کیا۔"

جناب پی. شیوشنکر نے مخدوم کے کردار کی سادگی اور حوصلوں کی بلندی پر روشنی ڈالی اور ان کی سیاسی خدمات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے مخدوم کی CPI سے وابستگی اور حیدرآباد میں ان کی عوامی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم ہمارے زمانے کی سیاسی شخصیات سے بہت مختلف تھے انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک بلند تر نصب العین کے لیے وقف کردی۔ جناب جی. وینکٹ سوامی نے مخدوم سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ مخدوم نے تمام عمر زمینی مسائل سے اپنی وابستگی کو قائم رکھا انھوں نے 1939 میں CPI جوائن کی۔ اور آخری وقت تک ایک فعال سماجی کارکن کی زندگی گزاری۔ جناب حبیب تنویر نے صدارتی تقریر میں مخدوم سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ مخدوم نے تلنگانہ تحریک میں جو رول ادا کیا وہ نہایت غیر معمولی ہے اور انھوں نے اپنے لیے جیسی خطروں بھری زندگی کا انتخاب کیا وہ کوئی معمولی شخص کر ہی نہیں سکتا۔ وہ ایک سچے اور کھرے فن کار تھے اور ایک بڑا فن کار جو خواب دیکھتا ہے انھوں نے نہ صرف وہ خواب دیکھے بلکہ اس کی عملی تعبیر کے لیے صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ مخدوم کی شاعری ترقی پسند شاعری کا سب سے خوبصورت نمونہ بلکہ رول ماڈل ہے۔

سہ روزہ سیمینار "مخدوم محی الدین — حیات اور کارنامے" کے دوسرے دن انڈیا اسلامک کلچر سینٹر کے ہال میں پورے ملک کے اسکالرس بڑی تعداد میں موجود تھے۔ پہلے اجلاس کا آغاز صبح 10 بجے ہوا۔ اس اجلاس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور محترمہ اودھیش رانی گوڑ نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر زینت ساجدہ کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے مخدوم صدی تقریبات کے سلسلے میں قومی اردو کونسل کی پیش قدمی پر مبارک باد پیش کی اور مخدوم کی ہر دلعزیزی اور شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ پروفیسر شارب ردولوی نے بعنوان "مخدوم کی نظموں کا آہنگ" پیش کیا، دوسرا مقالہ پروفیسر شمیم حنفی کا تھا جس کا عنوان تھا "مخدوم نعرے سے نغمے تک"، تیسرا پرچہ "مخدوم کی عشقیہ و رومانی شاعری" پروفیسر بیگ احساس کا تھا۔ پہلی صدارتی تقریر جناب حبیب تنویر نے پیش کی جس میں مخدوم سے اپنے ذاتی تعلقات اور مخدوم کے فن اور ان کے طرز حیات پر بڑے دلآویز انداز میں روشنی ڈالی۔ دوسری صدارتی تقریر جناب سدیپ بنرجی، تیسری صدارتی تقریر ڈاکٹر کملا پرشاد نے کی اور چوتھی صدارتی تقریر میں پروفیسر لطف الرحمن نے اردو اور فارسی شعریات کی روشنی میں مخدوم کی شاعرانہ خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالی۔

دوسرا اجلاس دوپہر کے دو بجے شروع ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی اردو کونسل) نے کی اراکین مجلس صدارت میں جناب سید شاہد مہدی، پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر رضا امام تھے۔ اس اجلاس کا پہلا پرچہ جناب رفعت سروش نے "انقلاب کا مغنی مخدوم محی الدین" کے عنوان

سے پیش کیا، رفعت سروش کے بعد ڈاکٹر ابوبکر عباد نے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو آواز دی انھوں نے مخدوم محی الدین پر ایک خاکہ پڑھ کر پوری محفل کو ہنساتے ہنساتے اشک بار کر دیا۔ تیسرا پرچہ "تغزل کی روایت اور مخدوم" پروفیسر لطف الرحمٰن کا تھا جسے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔ بعد ازاں پروفیسر انیس اشفاق نے "نعرۂ عشق بتاں در ہنگامۂ عہد زیاں" میں مخدوم محی الدین کی نظم اور غزل گوئی کا جائزہ لیا۔ پروفیسر انیس اشفاق کے بعد سکندر احمد نے "مخدوم محی الدین کا شعری آہنگ" کے عنوان سے پرچہ پیش کیا۔ پھر پروفیسر شہاب عنایت ملک نے "شاعر احتجاج مخدوم محی الدین" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد جناب سید شاہد مہدی نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام پرچوں پر اپنی رائے دی اور مخدوم پر کیے جانے والے کچھ اہم کام کی نشاندہی بھی کی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ سارے پرچے بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ اتنی ہی توجہ سے سنے بھی گئے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجتبیٰ صاحب کا تو ہنر یہ ہے کہ وہ ہنساتے ہنساتے رلا دیتے ہیں۔ ان کا مخدوم پر خاکہ بھی ایسا ہی تھا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کے پرچے کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ لطف الرحمٰن صاحب نے تو خیر طے کر رکھا ہے کہ وہ کبھی خراب پرچہ نہیں لکھیں گے۔ چنانچہ ان کا یہ پرچہ بھی نہایت ہی عمدہ تھا۔ انیس اشفاق کے پرچے کو بھی انھوں نے بہت اچھا اور مدلل بتایا۔ جناب رضا امام نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا مخدوم محی الدین کی حیات اور خدمات پر اس قدر کامیاب سیمینار منعقد کر کے آپ نے اردو کے ایک بڑے شاعر کو حقیقی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر علی جاوید (ڈائرکٹر، قومی اردو کونسل) نے تمام مہمانان و مندوبین کا شکریہ ادا کیا اور سید شاہد مہدی کی تجاویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا کہ قومی اردو کونسل بہت جلد مخدوم پر ایک بھرپور کتاب شائع کرے گی جس میں ان کی مستند سوانح حیات اور خدمات کا جائزہ شامل ہوگا۔

سہ روزہ سیمینار "مخدوم محی الدین ــــ حیات اور کارنامے" کے آخری دن انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں ملک کے مقتدر ادبا اور مقامی سامعین موجود تھے۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، جناب زبیر رضوی اور ڈاکٹر کھگیندر ٹھاکر نے کی۔ ڈاکٹر علی جاوید نے مہمانوں کا تعارف کرانے کے بعد سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور پہلے مقالے کے لیے محترمہ اودھیش رانی گوڑ کو دعوت دی۔ انھوں نے "مخدوم محی الدین یادوں کے جھروکوں سے" میں مخدوم محی الدین کی ذاتی زندگی پر بڑے دلآویز انداز میں روشنی ڈالی۔ جناب حسن یار ندوی نے "مخدوم محی الدین حیات و کارنامے" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے "احتجاج اور انقلاب کے درمیان مخدوم" اور پروفیسر قمر رئیس نے "آزاد نظم کا فارم اور مخدوم کی شاعری" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے مخدوم کی احتجاجی اور انقلابی شاعری کے فرق کو واضح کیا تو پروفیسر قمر رئیس نے آزاد نظم کی ہیئت کے حوالے سے مخدوم کے امتیازات پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر کملا پرشاد نے "مخدوم کی شاعری کا مزاج"، ڈاکٹر نکہت پروین نے "منفرد اور متوازن جذبات کا آئینہ مخدوم کی غزل"، ڈاکٹر ارجمند آرا نے "مخدوم کے تخلیقی سروکار"، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے "فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے"، پروفیسر اسلم آزاد نے "مخدوم کی شاعری میں تصور عشق کی حقیقت" اور جناب زبیر رضوی نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔

اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ تمام پرچوں پر فرداً فرداً گفتگو تو ممکن نہیں لیکن کچھ پرچے یقیناً بہت اچھے لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر کھگیندر ٹھاکر اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے بھی اپنے صدارتی کلمات میں مختصراً مخدوم کی ادبی حیثیت اور پرچوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر رضا امام اور جناب وی. نرسمہا راؤ نے کی اور نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل) نے۔ اس اجلاس میں جناب یوسف غوری نے "حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو"، ڈاکٹر محمد فیروز عالم نے "کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن اور مخدوم"، جناب کشمیری لال ذاکر نے "چمبیلی کے منڈوے تلے کا شاعر"، پروفیسر رضا امام نے "مخدوم کی شاعری میں تنوع" اور جناب وی. نرسمہا راؤ نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جناب وی. نرسمہا راؤ کا پرچہ انگریزی میں تھا اور سامعین نے اسے بھی بڑی دلچسپی سے سنا۔ اس اختتامی اجلاس کی صدارتی تقریر میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے مخدوم سے اپنی کئی ملاقاتوں کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ نظریاتی اختلافات کو مخدوم نے کبھی اپنے ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہونے دیا جو ان کی شخصیت کا بہت روشن پہلو تھا۔ سیاست اور شاعری ان کے یہاں باہم دست و گریباں ہے۔ دوسری زبانوں میں اس کی مثال ناظم حکمت اور پابلو نرودا کے یہاں اور اردو میں مخدوم سے پہلے اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ شعر کو بات بنانا اور بات کو شعر بنانا ان کا کمال تھا۔

ڈاکٹر علی جاوید (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل) نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سہ پہر کے اجلاس میں کسی سیمینار میں اتنے لوگوں کا موجود ہونا بذات خود مخدوم کی ادبی عظمت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔ انھوں نے ضمناً یہ ذکر بھی کیا کہ مخدوم کی ایک بہت اہم نظم جو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر لکھی تھی، کا ذکر یہاں کسی نے نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ نظم مخدوم کی اہم اور نہرو کی وفات پر کہی گئی سب سے خوبصورت نظم ہے۔

اردو کتاب میلہ — کولکاتا

● کولکاتا۔ 4فروری، پارک سرکس میدان میں منعقد ہونے والے 33ویں کتاب میلہ پر پابندی کے بعد اردو شائقین اور باذوق افراد کی تحریک پر مغربی بنگال اردو اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے اس کتاب میلہ کا انعقاد کیا گیا ہے۔ اس میلے کا انعقاد رفیع احمد قدوائی روڈ پر واقع اردو اکادمی کے گراؤنڈ فلور میں کیا گیا جس کا افتتاح آج ریاستی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر عبدالستار نے کیا۔ اس موقع پر اکادمی کی چیئر پرسن ڈاکٹر شہناز نبی، سکریٹری افضال احمد، ڈپٹی سکریٹری نشاط عالم اور دیگر سرکردہ افراد موجود تھے۔

کتاب میلے میں روز اوّل سے ہی لوگوں کا ہجوم رہا۔ بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات نے کتاب میلے سے استفادہ کیا۔ نئی نسل میں میلے کا رجحان سب سے زیادہ دیکھا گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی سیکنڈ ایئر کی طالبہ شازیہ نے کہا کہ ہم لوگ کتاب میلے کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ یہ میلہ خصوصی طور پر اردو کتابوں کے لیے منعقد کیا گیا ہے اس لیے ہمیں ایک ہی چھت کے نیچے طرح طرح کی کتابیں دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہاں ادب، مذہب، تاریخ اور دیگر موضوعات پر مبنی کی کتابیں دستیاب ہورہی ہیں۔ دوسری طرف تبسم نے جو اردو زبان سے واقف نہیں تھیں، کہا کہ میں اپنی والدہ کے لیے کتابیں خریدنے آئی ہوں لیکن یہاں طرح طرح کی کتابوں کو دیکھتے ہوئے میرے اندر بھی اردو پڑھنے کا شوق پیدا ہورہا ہے اور اب میں کوشش کروں گی کہ جلد از جلد اردو زبان سے واقفیت حاصل کروں۔ سیفی ہال کے طالب علم نے کہا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ آیا ہوں ادب سے مجھے خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن یہاں تاریخی اور مذہبی کتابوں کا کلیکشن قابل تعریف ہے۔

میلے میں آئے مولانا آزاد کالج کے ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے اس منی میلے کو منفرد میلہ بتاتے ہوئے میلے میں تمام اسٹالوں کی ستائش کی۔

(عکس سے)

دہلی میں "عالمی کتاب میلہ" کا افتتاح

● نئی دہلی۔ 2فروری، کتابیں ہماری بہترین دوست ہیں، کتابوں کی اہمیت اور افادیت آج بھی برقرار ہے اوران کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ نئی نسل کو کتابوں کے مطالعے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار آج پرگتی میدان کے ہنس دھونی تھیٹر میں 18ویں نئی دہلی عالمی کتاب میلہ کی افتتاحی تقریب میں مقررین نے کیا۔ تقریب کا آغاز علامہ اقبال کے ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سے ہوا۔

پروفیسر سی این راؤ نے کہا کہ کتابوں کا کوئی اور متبادل نہیں ہے اور لیپ ٹاپ یا انٹرنیٹ کتابوں کا متبادل نہیں بن سکتے۔ انھوں نے کہا کہ جب انٹرنیٹ آیا تو یہ کہا جانے لگا تھا کہ اب کتابوں اور کاغذ کی ضرورت ختم ہوجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا آج پہلے سے بھی زیادہ کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو اچھی تعلیم مہیا کرانے کے لیے حکومت کو اچھی کتابیں شائع کرانی چاہئیں۔ انھوں نے بچوں اور نوجوانوں کو مطالعے کی عادت ڈالنے کا مشورہ بھی دیا۔

پروفیسر یو آر اننت مورتی نے اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سماجی رشتے قائم کرنے میں کتابیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کتابوں کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے اور ان کا کوئی متبادل نہیں ہوسکتا۔ اننت مورتی نے کہا کہ کوئی بھی زبان عظیم یا ادنیٰ نہیں ہوتی۔ سب زبانیں برابر ہوتی ہیں اور حکومت کو تمام زبانوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے۔ سب کو برابر کے مواقع ملنے چاہئیں اور زبانوں کے معاملے میں سیاست نہیں ہونی چاہیے۔ انھوں نے نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی ستائش کی کہ وہ ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔

عالمی کتاب میلہ میں مہمان ملک روس کے نمائندے کے طور پر فیڈرل ایجنسی فار پریس اینڈ ماس کمیونیکشن روس کے ڈپٹی چیف آندرے رومین چینکو نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس کتاب میلے میں مہمان ملک کے طور پر شرکت کرکے روس خوشی محسوس کررہا ہے۔ ہم نے یہاں روس کی منتخب کتابوں کو نمائش کے لیے پیش کیا ہے۔ جن میں تاریخ، ثقافت، ادب، اسپورٹس، سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان اور روس کے دیرینہ تعلقات رہے ہیں اور ہندوستانی مصنفوں کی کتابوں کا بھی روس میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ پنچ تنتر، مہابھارت اور رامائن، جیسی کتابوں کے ترجمے پر مشتمل کتابیں بھی اس میلے میں پیش کی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کی سوانح حیات بھی ان میں شامل ہے۔ آندرے رومین چینکو نے کتاب میلے کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات پیش کیں۔

اس کتاب میلے کا افتتاح مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل ارجن سنگھ کو کرنا تھا لیکن ان کی غیر حاضری میں ان کا پیغام وزارت انسانی وسائل کے ایڈیشنل سکریٹری کے ایم اچاریہ نے پڑھ کر سنایا، جس میں ارجن سنگھ نے کہا کہ کتابیں ہماری بہترین دوست ہیں۔ ہندوستان نے جہاں سائنس وٹکنالوجی میں ترقی کی ہے وہیں کتابوں کی اشاعت میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔ انٹرنیٹ او رکمپیوٹر تکنیک کے ساتھ ساتھ ہماری پبلشنگ انڈسٹری کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا ہے اور کتابوں کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ برقرار ہے۔

روس کو میلہ میں مہمان ملک کا درجہ دیے جانے کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان تاریخی سیاسی وثقافتی رشتے رہے ہیں اور بہت گہرے مراسم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کلچرل کتابوں کی اشاعت میں نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کا بہت اہم رول ہے۔ انھوں نے کتاب میلہ میں شرکت کرنے والے تمام شرکاء کا خیر مقدم کیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے چیئرمین پروفیسر وپن چندرا نے کہا کہ این بی ٹی ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ این بی ٹی کے قیام کے 50 سال مکمل ہو چکے ہیں اور اپنے گولڈن جوبلی سال میں اس نے 23 ہندوستانی زبانوں میں 52 کتابیں شائع کی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

علامہ شبلی نعمانی: حیات و خدمات پر دو روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 9 فروری، علامہ شبلی نشاۃ الثانیہ کے معماروں میں سے تھے۔ ان کا نثری اسلوب بنیادی اسالیب نثر میں سے ایک ہے اور وہ ہمارے ادب عالیہ کا اہم جز ہے۔ شبلی کے اثرات بعد کے ناقدین ادب نے قبول کیے۔ ان خیالات کا اظہار آج علامہ شبلی نعمانی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن ولادت کے موقع پر اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام غالب اکادمی حضرت نظام الدین میں منعقد مذاکرہ بعنوان ''علامہ شبلی نعمانی: حیات و خدمات'' کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کے دوران صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کیا۔ مجلس صدارت کے دیگر اراکین میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی اور گلزار دہلوی شامل تھے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ اس سیمینار کے بعد ہم اپنے بزرگوں کو ایک نئے تناظر میں دیکھ سکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ تفہیم و تحقیق کی ایک طویل عمر ہوتی ہے۔ اب اس طویل مدت کے بعد ہم سرسید اور شبلی کی تحقیق و تفہیم کر سکتے ہیں۔ مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ شبلی وہ عالم دین ہیں جو مغرب سے مرعوب نہیں ہوئے اور نہ ہی مستقبل سے شرمندہ تھے۔ انھوں نے اپنے مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا۔ عطاء الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ ان کی کتاب ''سیرت النبی'' عوامی کتاب ہے۔ علم کلام اور علم عقائد پر ان کی گفتگو لاثانی ہے۔ ہمیں اس نہج پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر افتخار عالم خاں، ڈاکٹر کوثر مظہری اور سید محمد اسمٰعیل نے مقالے پیش کیے۔

دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر رضی الدین شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر شاہد تسلیم نے کی۔ اجلاس کے آغاز میں تیسیر مظفر نے ''شبلی کی سخنوری'' پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سیاسی ادب کے نگار خانے میں شبلی کی نظمیہ شاعری اولیت کا درجہ رکھتی ہے اور ان نظموں کے موضوعات آج بھی مستحکم اور مسلم ہیں۔ ڈاکٹر علاء الدین نے ''شبلی اور دارالمصنفین کی تاریخ'' پر مقالہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر فرید پربتی نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ سیمینار میں شرکت کرنے والے اہم افراد میں پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر راشد عزیز اور محترمہ ذکیہ ظفر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ڈاکٹر نیر مسعود 'سرسوتی سمان' کے لیے منتخب

● نئی دہلی۔ 14 فروری، اردو کے ممتاز ادیب اور قلم کار ڈاکٹر نیر مسعود کو ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''طاؤس چمن کی مینا'' کے لیے 2007 کے 'سرسوتی سمان' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ کے۔کے۔ برلا فاؤنڈیشن کی طرف سے دیا جانے والا یہ انعام 5 لاکھ روپے اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ یہ انعام ہر سال آئین کی آٹھویں فہرست میں درج زبانوں میں سے کسی بھی زبان میں انعام کے سال سے 10 برس پہلے کی مدت میں شائع ممتاز ادبی تخلیق پر دیا جاتا ہے۔ اب تک ہندی اور دیگر زبانوں کے 16 ادیبوں کو یہ اعزاز دیا جا چکا ہے۔ اردو میں اس سے پہلے یہ اعزاز ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کو پیش کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود 1936 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کیا اور اس کے بعد اسی یونیورسٹی سے 1957 میں فارسی میں ایم۔اے۔ کی ڈگری لی اور پھر الہ آباد یونیورسٹی سے 1965 میں اردو میں اور لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں پی۔ایچ۔ڈی۔ کی۔ وہ 21 سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں اور اردو و فارسی میں ان کے تقریباً 200 سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود کی کتابیں اور کہانیاں فرانسیسی، انگریزی اور فنش میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

وہاب اشرفی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

● اس سال ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اردو کا ایوارڈ مشہور ادیب اور ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی کو ان کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' پر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور عہد قدیم کے موجودہ دور تک کے ادبی کوائف کا احاطہ کرتی ہے۔ وہاب اشرفی کی اب تک تیس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سات جلدوں پر مشتمل ''تاریخ ادبیات عالم'' بھی شامل ہے جو اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا علمی کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں دنیا کی تمام اہم زبانوں کے شعر و ادب کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی

ہیں۔ ان کی دیگر کتابیں بھی ان کی وسیع معلومات اور ان کی علمی بصیرت کا آئینہ ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو اکادمی دہلی کے 2007 کے ایوارڈز کا اعلان

● نئی دہلی۔ 8فروری، ملک گیر سطح پر ادب کی مجموعی خدمات کے صلے میں اردو اکادمی دہلی کا سب سے بڑا اعزاز ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' اس بار معروف نقاد، ادیب اور دانشور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی (الہ آباد) کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ اعلان اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت کی رہائش گاہ پر ان کی موجودگی میں کیا۔ 2007 کے لیے اکادمی کے باقی انعامات کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔ دہلی کی تہذیب و روایت کے علمبردار پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کو ''پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ'' سے نوازا گیا ہے۔ اردو اکادمی کی ایوارڈ اور کلچرل سب کمیٹی کی سفارش کو منظوری دیتے ہوئے ایگزیکیٹو کمیٹی نے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس کی صدارت میں سالانہ ایوارڈز کی تصدیق کردی جسے وزیر اعلیٰ نے بھی اپنی منظوری دے دی ہے۔ اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز ''بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' جو مبلغ ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے پر مشتمل ہے اور ملک گیر سطح پر ادب کی مجموعی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے۔ ''پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ'' کی رقم مبلغ اکیاون ہزار روپے ہے۔ اکادمی کے دیگر انعامات میں سابق ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین کو ان کی اردو زبان کے فروغ کے لیے بے لوث خدمات کے اعتراف میں ایک ''خصوصی ایوارڈ برائے فروغ اردو زبان'' دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی کو اردو تحقیق و تنقید کے لیے، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر نصیر احمد خاں کو لسانیاتی تحقیق کے لیے، معروف ادیب و فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کو تخلیقی نثر کے لیے، طنز و مزاح نگار منظور عثمانی کو طنز و مزاح کے لیے، محمد علی کو سائنسی ادب کے لیے، معروف و ممتاز خطاط عطاء اللہ اختر کو بہترین خطاطی اور مشیدہ عثمانی اور طالبہ خاتون کو بہترین استاد کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ جلسہ تقسیم ایوارڈ مارچ میں منعقد کیا جائے گا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

شولا پور میں کل ہند اردو ادبی کانفرنس

● شولا پور، 2فروری۔ سہ روزہ اردو ادبی کانفرنس کا پہلا اجلاس 2فروری 2008 کی صبح دس بجے سرتی مندر میں منعقد ہوا جس کی صدارت گلزار دہلوی نے کی اور ڈاکٹر محمود الرحمٰن سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت محترم زاہد علی خاں مدیر سیاست نے کی اور اس میں ڈاکٹر مشتاق صدف، جیلانی بانو، نور العین علی، صلاح الدین نیر نے مقالے پیش کیے۔ 3فروری 2008 کی رات 8 بجے ایک جث تھیٹر نے اپنا ڈراما ''بیگم جان'' پیش کیا۔ 3فروری 2008 صبح نو بجے ''اردو جلوس'' کا انعقاد کیا گیا اور دس بجے اس ادبی کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح مرکزی وزیر توانائی جناب سشیل کمار شندے نے کیا۔ رات آٹھ بجے مشاعرہ ہوا جس کی صدارت بیکل اتساہی نے کی اور نظامت جناب ش۔ک۔ نظام نے۔ اس مشاعرے میں ملک کے مختلف حصوں سے تشریف لائے سرکردہ شعرائے کرام کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، مظفر حنفی، صلاح الدین نیر، رؤف خیر اور دیگر کئی۔ 4فروری 2008 کو ثقافتی پروگرام میں مقامی طلبہ و طالبات نے حصہ لیا اور شام 4 بجے عالمی شہرت یافتہ فنکار جناب غلام علی (پاکستان) نے اساتذہ کی غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (ڈاک سے)

کشمیر میں ''یوم اقبال'' کی تقریبات

● کشمیر یونیورسٹی اور ڈائریکٹوریٹ آف اسکول ایجوکیشن کشمیر کے زیر اہتمام ''یوم اقبال'' کی تقریبات منائی گئیں۔ مقررین نے اقبال کے آفاقی پیغام کی معنویت پر روشنی ڈالی اور شاعر مشرق کے افکار و نظریات کی موجودہ عہد میں افادیت پر سیر حاصل بحث کی۔ اس تقریب میں شیدایان اقبال اور عمائدین شہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالواحد قریشی نے کی۔ شعبۂ تعلیم کشمیر کے سربراہ جناب محمد رفیع مہمان خصوصی تھے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اسکولی درسیات میں اخلاقیات اور اقبالیات کی شمولیت پر زور دیا۔ یونیورسٹی میں منعقدہ اس تقریب کی میزبانی معروف ماہر اقبالیات اور ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے انجام دی۔ اس تقریب میں ڈاکٹر طارق مسعودی لکچرر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد کی انگریزی کتاب "Al-Ghazali and Iqbal: Their Perspective on Education" ڈاکٹر فرید پربتی کی کتاب ''مقدمۂ صنف رباعی'' اور کشمیر کے سرکردہ فارسی اور کشمیری شاعر مرحوم خواجہ غلام حسن محوی کی حیات، شخصیت اور شاعری پر مشتمل کتاب ''ارمغان محوی'' کی رسم رونمائی وائس چانسلر اور ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشنل کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ نشست اول کی نظامت ڈاکٹر سید مجید اندرابی نے کی اور شکریہ ڈاکٹر مشتاق احمد نے ادا کیا۔ ''یوم اقبال'' کی دوسری نشست محفل مشاعرہ پر مبنی تھی، جس میں اردو اور کشمیری شعرا نے اقبال کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب سیفی سوپوری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرید پربتی نے احسن

طور پر نبھائے۔ یونیورسٹی کی اس تقریب میں وائس چانسلر نے اقبال کے نام پر ایک ''یادگار عمارت'' تعمیر کرنے کا اعلان کیا، جس میں ایک سیمینار ہال، ایک میوزیم اور ایک شاندار لائبریری ہوگی۔ ایک کروڑ چھبیس لاکھ روپے کی لاگت سے بننے والی اس عمارت کے لیے ٹینڈر طلب کیے جاچکے ہیں۔

یوم اقبال کی دوسری روح پرور تقریب ڈائرکٹوریٹ آف اسکول ایجوکیشن کشمیر کے زیر اہتمام اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اسکول ایجوکیشن سرینگر کے بڑے ہال میں منعقد ہوئی۔ شعبۂ تعلیم کے سربراہ جناب محمد رفیع نے فکر اقبال کی آفاقیت، اہمیت اور عظمت کا ذکر کیا اور کشمیر کے ساتھ اقبال کے گہرے جذباتی رشتے کی وضاحت و صراحت کی۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ رواں سال کے ماہ اپریل کی 21 تاریخ کو کشمیر کے گیارہ ہزار اسکولوں میں ''یوم اقبال'' منایا جائے گا کیونکہ ایسی تقاریب منانے سے نئی نسل اقبال کی فکر و نظر سے فیضان پانے میں کامیاب ہوگی۔ ڈائرکٹوریٹ آف اسکول ایجوکیشن اور اردو اکادمی کشمیر کے اس مشترکہ جلسے سے پروفیسر رشید نازکی، پروفیسر شیخ محمد اقبال، پروفیسر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر عزیز حاجنی، جناب اعجاز احمد ککرو اور دیگر سرکردہ شخصیتوں نے بھی خطاب کیا۔ (ڈاک سے)

ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ''ادب اطفال'' پر سیمینار

● پنچکولہ۔ 6 فروری، ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ''ادب اطفال'' کے موضوع پر ایک کُل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے دوران بچوں کے ادب کی موجودہ صورت حال، مستقبل میں اس کے امکانات، کمپیوٹر کے زمانے میں کتابی ادب کی اہمیت وغیرہ، اہم موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی اور ادب اطفال کے تعلق سے کئی ٹھوس اور اہم باتیں سامنے آئیں۔ اس بات پر خصوصاً زور دیا گیا کہ بچوں کے ادب کو آسان، معلوماتی اور رنگین ہونا چاہیے۔ اس میں ہندوستان اور ہندوستانی کی تہذیب کے رنگ نمایاں ہوں۔

اس ورکشاپ کا افتتاح ہائر ایجوکیشن کمشنر، جناب شورمن گوڑ آئی۔اے۔ایس۔ نے کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ وہ ادب تحریر کیا جائے جو بچوں کے لیے، بچوں کے بارے میں اور بچوں کے ذریعے ہو۔ ادب اطفال کا آج کی ضرورتوں کے تحت ہونا نہایت ضروری ہے۔ کتابیں دیدہ زیب اور رنگین ہوں تاکہ بچوں کو پسند آئیں۔ سیمینار کے آخری اجلاس میں جو تجاویز اتفاق رائے سے پیش کی گئیں وہ اس طرح ہیں:

1. بچوں کے ادیبوں کو ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مناسب مالی تعاون دیا جائے۔
2. اکادمی کے سہ ماہی مجلّہ ''جمنا تٹ'' میں 10 صفحات پر مشتمل بچوں کا ایک گوشہ ہو۔
3. بچوں کے مشہور ادیبوں کی کتابیں ہریانہ اردو اکادمی اپنی لائبریری کے لیے خریدے۔
4. بچوں کے لیے ناولٹ/کہانیوں کی شکل میں لکھی گئی بہترین کتاب کے مصنف کو -/21000 روپے کا انعام دیا جائے۔

ادب اطفال سیمینار میں جن اسکالروں اور قلم کاروں نے اپنے گرانقدر مقالے پیش کیے ان میں ہمایوں ظفر زیدی، ڈاکٹر خوشحال زیدی، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر خسرو متین، مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر محمد خلیل، ڈاکٹر راجندر وتس اور ڈاکٹر فرزانہ نسیم شامل ہیں۔ اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سیمینار کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے اجلاس کی نظامت شمس تبریزی نے کی۔ (ڈاک سے)

پروفیسر ریاض پنجابی کو قومی اردو کونسل کا استقبالیہ

● نئی دہلی۔ 5 فروری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے آج سہ پہر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، میکسو لر مارگ، نئی دہلی کے سینٹرل کورٹ میں پروفیسر ریاض پنجابی، (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کے اعزاز میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں بڑی تعداد میں شہر کے ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ ظہرانے سے قبل ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے پروفیسر ریاض پنجابی کو خوش آمدید کہا۔ سید شہاب الدین نے موصوف کی خدمت میں شال پیش کر کے ان کا استقبال کیا۔ واضح ہو کہ پروفیسر ریاض پنجابی حال ہی میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے سرفراز کیے گئے ہیں۔ پروفیسر موصوف کا کردار اردو زبان اور اس کے فروغ کے سلسلے میں ہمیشہ مجاہدانہ رہا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اردو کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے ہیں۔ پروفیسر ریاض پنجابی کی جملہ کارکردگی کو پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ پروفیسر ریاض پنجابی کی قیادت میں اردو کے فروغ کے امکانات روشن ہوں گے اور ان کی تقرری کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ظہرانے میں شمیم فیضی، پروفیسر نصیر احمد خاں، فیاض شہریار، شاہد ماہلی، ڈاکٹر شاہد پرویز ایس۔آر۔ گیلانی، شیخ منظور احمد، ڈاکٹر ایم۔اے۔ ابراہیمی، ڈاکٹر محمود فیاض ہاشمی اور ڈاکٹر آر۔کے۔ بھٹ و دیگر اہم شخصیات بھی شریک تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

انتظار حسین کا نیا مقام

● نئی دہلی۔ یکم فروری، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ساہتیہ اکادمی کے فیلوشپ پر پاکستان سے آئے اردو کے معروف و مشہور فکشن نگار انتظار حسین کو

استقبالیہ دیا گیا۔ جلسے کی صدارت ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئر مین پروفیسر ویر بھارت تلوار نے کی۔ ڈاکٹر انور پاشا نے اپنے استقبالیہ خطبے میں انتظار حسین کی تخلیقات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انتظار حسین اردو فکشن کے لی جنڈ (legend) ہیں۔ ان کے فکشن پر ہندوستانی تہذیب، دیو مالا اور لوک گاتھاؤں کے نمایاں اثرات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انتظار حسین نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب فکشن کی دنیا میں بڑے بڑے فنکار موجود تھے لیکن انتظار حسین نے اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے اپنی الگ پہچان بنائی۔ ڈاکٹر پاشا نے کہا کہ انتظار حسین کے یہاں ماضی ایک اہم استعارے کے طور پر ابھرتا ہے، چاہے وہ افسانہ ہو یا ناول۔ ایک ایسا استعارہ جس میں انسان کے جنم جنم کی کہانیاں موجود ہوتی ہیں۔ انتظار حسین اپنے علامتی اور استعاراتی انداز کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی معنوی تہہ میں اترنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس مخصوص تہذیبی پس منظر سے واقف ہوں۔ انتظار حسین نے اپنے دو افسانے ''کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا'' اور ''مور نامہ'' پڑھ کر سنائے جن میں گلوبلائزیشن سے پیدا شدہ صورت حال اور ہندو پاک میں ایٹم بم کے تجربے اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ جنگی ماحول کے بھیانک نتائج کی جانب بڑے خوبصورت اشارے موجود تھے۔ انتظار حسین نے اپنی گفتگو میں کہا کہ آج انسان پناہ ڈھونڈ رہا ہے لیکن اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی ہے۔ سامعین نے دونوں افسانوں کو بہت سراہا۔ حاضرین نے انتظار حسین کے فن اور دیو مالا کے حوالے سے بہت سارے سوالات کیے۔ انتظار حسین نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں اپنی کہانیوں میں دیو مالا کا استعمال اس لیے کرتا ہوں کہ یہ ہندوستانی تہذیب کا اہم حصہ ہیں اور ہماری جڑیں اسی خطے میں پیوست ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے شعبے کے صدر پروفیسر ویر بھارت تلوار نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہمیں کسی ادب کی تفہیم میں ایک ہی لیبل کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ انتظار حسین کسی ایک ملک، ایک تہذیب، ایک مذہب کے تخلیق کار نہیں ہیں بلکہ پورے برصغیر کے ادیب ہیں۔ ان کی کہانیاں صرف ماضی کی داستان نہیں ہیں بلکہ آج کی دنیا کے سلگتے سوالوں کو اٹھانے کے لیے انھوں نے مہابھارت اور دوسری جنگوں کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ اس پروگرام میں جن مقتدر اہل علم و ادب نے شرکت کی ان میں پروفیسر چمن لال، ڈاکٹر غضنفر، پیغام آفاقی، ڈاکٹر خواجہ اکرام، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، ڈاکٹر گووند پرشاد، ڈاکٹر دیوندر چوبے، مرزا باقی بیگ اور ڈاکٹر محمد ضیاء الہدیٰ انصاری وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● کولکاتا۔ 11 فروری، ''اپنی کہانیوں کے بارے میں کچھ بولنا کہانی کار کا کام نہیں یہ کام دانشوروں اور نقادوں کا ہے۔ کہانی کار کا کام بس کہانی لکھنا ہے، اسے سمجھنا اور اس کے معنی نکالنا قارئین کا کام ہے۔'' یہ الفاظ انتظار حسین نے اپنے اعزاز میں ماہنامہ ''انشا'' کی جانب سے اپانندر اہال میں منعقد کی گئی استقبالیہ تقریب میں سامعین کے سوالوں کے جواب میں کہے۔ قبل ازیں انھوں نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں کہا کہ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے پریم چند فیلوشپ دیے جانے کے بعد وہ ہندوستان کے دورے پر آئے ہیں اور کولکاتا میں ان کی آمد بھی ساہتیہ اکادمی کے پروگرام کا حصہ ہے۔ انتظار حسین نے کہا کہ انھوں نے پریم چند کی بازیافت کی ہے کیونکہ برسوں پہلے انھوں نے پریم چند کو ترقی پسندوں کے مقابلے میں مسترد کر دیا تھا لیکن جب پریم چند کے افسانوں کا دوبارہ مطالعہ کیا تو انھیں ایسا لگا کہ اس افسانہ نگار کو انھوں نے دوبارہ دریافت کیا ہے۔ پریم چند ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے آج ہمیں بہت بڑے لگتے ہیں کیونکہ ان کی کہانیوں میں مختلف حسیات آ کر مل گئی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے پریم چند کے ایک افسانے ''پوس کی رات'' کا تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ پریم چند کا سب سے بہتر افسانہ ہے جس کی کڑی ہندو اور اسلامی اساطیر سے جڑتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے ایک کہانی کار کی حیثیت سے اپنی داخلی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے ''کتھا ساگر'' کا حوالہ دیا جس میں ایک کہانی کار اپنی بہت ساری کہانیوں کو لے کر راجہ کے پاس جاتا ہے اور جب راجہ سننے کے بعد اسے دربار سے نکال دیتا ہے تو وہ جنگل میں جا کر ایک الاؤ جلا کر اپنی ایک کہانی جانوروں کو سناتا ہے اور پھر اسے جلا دیتا ہے۔ جب آخری کہانی بچ جاتی ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ راجہ بیمار پڑ جاتا ہے اور لوگ اسے مشورہ دیتے ہیں کہ جس کہانی کار کو آپ نے دربار سے نکال دیا تھا اس کی کہانی سن کر آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو وہ کہانی کار دربار میں پہنچ کر اپنی کہانی سناتا ہے۔ اس طرح اس کی کہانی ''کتھا ساگر'' بچ جاتی ہے۔ یہ کہہ کر انتظار حسین نے کہا کہ ''آج کے دور میں جب ادب کی قدر و قیمت نہیں رہی تو ہمیں بھی اپنی کہانیوں کو لے کر جنگل کی طرف جانا ہوگا لیکن مصیبت یہ ہے کہ جنگل بھی تیزی سے کٹتے جا رہے ہیں۔ آج کا انسان بہت آگے بڑھ گیا ہے اور نیچر بہت پیچھے رہ گیا ہے۔'' اپنی کہانیوں سے داستانوں کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے انتظار حسین نے کہا کہ ''میں نے کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو وغیرہ کے دور سے کہانی لکھنا شروع کیا لیکن ماضی کی تلاش میں داستانوں اور پھر اساطیر تک پہنچ گیا۔'' انتظار حسین نے کہا کہ داستانوں میں تمام مخلوقات ایک دوسرے سے پیوست نظر آتی ہیں لیکن یہ تعلق آج ختم ہو چکا ہے۔'' انتظار حسین کے اعزاز میں منعقد اس تقریب کا افتتاح مشہور شاعر جناب قیصر شمیم نے کیا جنھوں نے مہمان افسانہ نگار کا استقبال کرتے ہوئے ماہنامہ ''انشا'' کے مدیر

ف۔س۔اعجاز کا شکریہ ادا کیا جن کی کوششوں سے یہ جلسہ منعقد ہوا اور ساتھ ہی افسانہ نگار کے ادبی سفر کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

دہلی اردو اکادمی فیلوشپ کا آغاز

● نئی دہلی۔ 11 فروری، وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کی صدارت میں اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کی میٹنگ میں اکادمی کی جانب سے فیلوشپ شروع کرنے کے فیصلے کے تحت اکادمی نے یکم اپریل سے اس فیلوشپ کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیلوشپ ان قلمکاروں کو دی جائے گی جنھوں نے اپنی زندگی اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ اردو زبان اور شعروادب کی خدمت کرنے میں صرف کیا ہے اور جو کسی سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ملازم نہیں ہیں۔ فیلوشپ کی تعداد تین ہے۔ ان میں دو دہلی کے اور ایک بیرون دہلی کے ادیبوں کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ فیلوشپ 55 سال سے زیادہ عمر کے فعال قلمکاروں کو تفویض کی جائے گی۔ فیلوشپ پانے والے ادیبوں کو اکادمی دو سال کے لیے پانچ ہزار روپے ماہانہ ادا کرے گی۔ اس مدت میں وہ اپنی پسند کے کسی موضوع پر تصنیف وتالیف کا کام انجام دیں گے جسے اکادمی شائع کرے گی۔ فیلوشپ کمیٹی نے اپنی ایک میٹنگ میں پہلی فلوشپ کے لیے رفعت سروش، پروفیسر عتیق اللہ اور عابد سہیل (لکھنؤ) کا انتخاب کیا ہے۔ یہ فیلوشپ یکم اپریل سے جاری کی جائے گی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

مولانا محمد علی جوہر پر سیمینار

● حیدرآباد۔ اسلاف کی زندگی اور ان کے کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرانے کے لیے صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی، عثمان باغ، بہادر پورا حیدرآباد نے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں صمدانی کمپیوٹر اینڈ لینگویجز سنٹر ملحقہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر کی حیات اور کارناموں پر مشتمل نمائش ترتیب دی گئی جس میں مولانا محمد علی جوہر کی ابتدائی زندگی دکھائی گئی تھی اور آگے چل کر انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھیں بھی اجاگر کیا گیا تھا۔ نمائش کے افتتاح کے موقعے پر مولانا خلیل احمد ندوی نظامی سابق اپی گرافسٹ محکمۂ آثار قدیمہ حکومت آندھرا پردیش و چیئرمین صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی کی صدارت میں سیمینار منعقد ہوا جس میں پروفیسر ڈاکٹر افشار عالم نے چیف گیسٹ کی حیثیت سے شرکت کی، جناب ابن غوری سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، جناب عارف صدیقی نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے مخاطب کیا اور مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ محمد انوارالدین صدیقی نے شکریہ ادا کیا، توفیق احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سیمینار کے دوسرے سیشن کے مہمانان خصوصی جناب محمد عظمت اللہ بیابانی اور جناب کے سبا راؤ نے طلبہ سے خطاب کیا، آخری سیشن جناب ظہیر الدین علی خان مینیجنگ اڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' کی صدارت میں ہوا، مقالہ نگار ڈاکٹر مظہر امام اور مولانا شیخ حسین صاحب تھے۔ مصدق احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ (ڈاک سے)

جنوبی ایشیائی زبانوں پر توسیعی خطبہ

● علی گڑھ۔ 06 جنوری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے زیر اہتمام جنوبی ایشیائی زبانوں پر آٹھویں عالمی کانفرنس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے ڈائرکٹر پروفیسر یو این سنگھ نے کہا کہ جنوبی ایشیا کے ممالک میں آپس میں لسانیاتی، مذہبی اور ثقافتی سطح پر یکسانیت پائی جاتی ہے اور ہمیں آپس میں مل کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان ممالک کے عوام ایک دوسرے کے مزید قریب آسکیں۔

انھوں نے کہا کہ جنوبی ایشیائی ممالک میں آج کے تیز رفتار دور میں متعدد زبانیں اور ان کے بولنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے لسانیاتی سائنس دانوں کو اس کا مطالعہ کرکے ایک مستحکم حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔ پروفیسر یو این سنگھ نے کہا کہ جنوبی ایشیائی ممالک میں زبانوں کے فروغ پانے کا سبب یہاں ٹالرینس کا ہونا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف زبانوں میں مہیا متن کا ترجمہ کرکے ان کو مزید مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر یو این سنگھ نے کہا کہ ہندوستان میں فی الوقت 179 زبانیں اور 544 بولیاں ہیں۔ ان میں 14 سرکاری زبانیں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں ریڈیو، اخبار اور رسائل کے توسط سے زبانوں کو فروغ دینے کی سمت میں اہم کام ہوا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی. کے. عبدالعزیز نے کہا کہ انسانی تہذیب کے ساتھ زبانیں بھی پیدا ہوئیں اور زبانوں کی پیدائش سے ہی انسان نے علم حاصل کیا۔ حالانکہ چند سیاسی وجوہات کے سبب کچھ زبانوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو ان کو ملنا چاہیے تھا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان کو سب سے زیادہ فائدہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے پہنچا ہے اور سائنس کی زبان بننے کے بعد ہی آج دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں انگریزی پڑھی لکھی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں بھی قومی زبان کو مزید تقویت حاصل ہونی چاہیے اور علاقائی زبانوں کو مزید مضبوط بنانے کی سمت میں کام ہونا چاہیے۔ وائس چانسلر نے اس کانفرنس کی کامیابی کی توقع کرتے ہوئے کہا کہ یہ

کانفرنس ختم ہوتی ہوئی زبانوں کے تحفظ کے لیے بھی کام کرے گی۔

حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبۂ لسانیات کے سربراہ اور کانفرنس کے ڈائرکٹر پروفیسر اے۔آر۔ فتیحی نے کہا کہ یو۔این۔او۔ نے 2008 کو زبانوں کے عالمی سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مختلف زبانوں کی مدد سے اتحاد کو فروغ دیا جاسکے۔ پروفیسر فتیحی نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کا قیام آج سے چالیس سال قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مسعود الحسن نے کیا تھا جس کا مقصد جنوبی ایشیائی زبانوں کو فروغ دینا تھا اور وہ خود بھی اس شعبے کے سربراہ رہے۔ پروفیسر فتیحی نے کہا کہ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد جنوبی ایشیائی زبانوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنا ہے تاکہ لسانی اتحاد کو فروغ دیا جاسکے۔

کانفرنس سے ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کے پروفیسر بورس اے زخرین و پیرس فرانس کی پروفیسر اینی مونتوٹ نے بھی خطاب کیا۔ آخر میں پروفیسر امتیاز حسنین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شبانہ حمید نے انجام دیے۔ اس کانفرنس میں امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس، جرمنی، پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ کے مندوبین نے بھی حصہ لیا۔ (ڈاک سے)

جے این یو میں ''جدید فارسی شاعری'' پر توسیعی خطبہ

● نئی دہلی۔ 8 فروری، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام اسکول آف لینگو یجز کے سیمینار ہال میں ''جدید فارسی شاعری'' کے موضوع پر توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ اس توسیعی خطبے کے لیے مرکز تحقیقات، ایران کلچرل ہاؤس کے ڈائرکٹر علی رضا قزوہ مدعو تھے۔ انھوں نے جو بذات خود شاعر و ناقد ہیں تفصیل کے ساتھ گذشتہ ایک صدی کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی ابتدا شعبے میں ایم اے کی طالبہ سیما نے امیر خسرو کی غزل پڑھ کر کی۔ صدر شعبہ پروفیسر سید اختر مہدی نے مہمان کا خیر مقدم کیا اور ان کا تعارف پیش کیا اور شعبے میں جدید فارسی درس و تدریس کے حوالے سے گفتگو کی۔ شعبے کے استاد اور شاعر ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے اپنی فارسی نظم 'سرزمین فخر گیتی' سنائی اور پروگرام کی نظامت کی۔ ڈاکٹر قزوہ نے اپنے لیکچر کے دوران ہندوستانی شعرا و ادبا کی خدمات کا ذکر کیا۔ آخر میں طلبہ نے ان کے لیکچر کے حوالے سے سوالات کیے۔ پروفیسر صدیق نیاز مند نے مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔
(راشٹریہ سہارا، دہلی)

قاسم انصاری (نمائندہ ای ٹی وی) کو ایوارڈ

● نئی دہلی۔ حال ہی میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اردو نصاب پر سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد (28،30 دسمبر 2007) کیا گیا تھا، جس میں ملک کی تقریباً 42 مختلف یونیورسٹیوں کے صدور شعبہ و نمائندوں نے شرکت کی۔ ان شرکا میں راجستھان کی اودے پور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ ڈاکٹر رئیس احمد نے بھی شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر رئیس احمد اپنے دونوں ہاتھوں پیروں سے معذور ہیں لیکن وہ درس و تدریس کے فرائض بحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ ای ٹی وی اردو نے اس سہ روزہ ورکشاپ پر اپنا خصوصی پروگرام بھی پیش کیا ساتھ ہی اردو قارئین و سامعین کو بھی اس اہم نکتے کی طرف متوجہ کیا کہ آخر کیسے ایک معذور شخص صحیح و سالم لوگوں کے مدِّ مقابل کھڑا ہے۔ ای ٹی وی نمائندہ قاسم انصاری نے ڈاکٹر رئیس احمد پر اس نقطۂ نظر سے خصوصی اسٹوری تیار کی کہ جسمانی معذوری کے باوجود تعلیم و تدریس کے علاوہ زندگی کی دیگر ذمے داریوں کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے عزم و حوصلے اور محنت و لگن کی جیسی مثال قائم کر رہے ہیں وہ اپنے آپ میں درس عبرت ہے۔ انھوں نے اپنے عمل اور حوصلے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر انسان ذہنی طور پر تنومند ہو تو جسمانی معذوری عزم و حوصلے کو بھی توانائی بخشتی ہے۔

ای ٹی وی کے اردو چینل پر (جنوری 2008 میں) جب یہ اسٹوری نشر کی گئی تو ای ٹی وی نیٹ ورک کی جانب سے اسے ایک مثالی اسٹوری قرار دیا گیا اور اسٹوری میکر جناب قاسم انصاری کو خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی۔ 30 جنوری، اردو محبت، یک جہتی اور تہذیب کی زبان ہے، گرچہ آج اس زبان کو روزگار کی زبان نہیں بننے دیا جا رہا ہے لیکن اس کے چاہنے والے اسے اپنے آپ سے کبھی جدا نہیں ہونے دیں گے اور اردو زبان کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار آج لال قلعے کے سبزہ زار پر ''مشاعرۂ جشن جمہوریت'' کے موقعے پر مقررین نے کیا۔ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر رام ولاس پاسوان نے کہا کہ اردو ہماری اپنی زبان ہے۔ ایک وقت تھا جب اردو عوامی اور رابطے کی ہی نہیں بلکہ سرکاری کام کاج کی بھی زبان تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد سب سے پہلے اردو کو ختم کرکے اس کی جگہ انگریزی تھوپنے کی کوشش کی۔ کم و بیش آج بھی یہی صورت حال ہے اور صرف انگریزی ہی روزگار کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان سب کے باوجود اردو ایک مضبوط زبان ہے جسے کوئی ختم نہیں کرسکتا۔ انھوں نے اس موقعے پر پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفر کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ وہ عظیم شاعر بھی تھے اور وطن کے سچے سپوت بھی۔ دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے بطور مہمان خصوصی اپنی مختصر تقریر

میں کہا کہ یہ تاریخی مشاعرہ دو سال تک تال کٹورہ اسٹیڈیم میں منعقد ہوا لیکن وہاں مشاعرے کی اصل روح ختم ہوگئی تھی اس لیے ہم اس مشاعرے کو لال قلعے میں واپس لائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو دہلی کی تہذیب کی بنیاد ہے اور اسے اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے ہی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس فیصلے پر عمل نہیں ہوا تو کسی بھی فیصلے پر عمل کرانے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ شیلا دکشت نے اردو اکادمی کو ہدایت دی کہ وہ علی سردار جعفری کے ''ترانۂ اردو'' کو اردو اکادمی کا ترانہ بنائیں اور اس کی زیادہ سے زیادہ سی ڈی جاری کرائیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے شعیب اقبال نے مشاعرے کو دوبارہ لال قلعے میں واپس لانے اور اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے شیلا دکشت کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ کی موجودگی میں یہ اعلان بھی کیا کہ دہلی سرکار نے عظیم مجاہد آزادی بہادر شاہ ظفر کی یاد میں جلد ہی لال قلعے کے دیوان خاص میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرانے کی اس تجویز کو قبول کرلیا ہے۔ شعیب اقبال نے کہا کہ اردو اور مشاعرہ دہلی کی تہذیب کا اہم حصہ ہے اور ان کے تحفظ کے لیے ہم اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس موقع پر دہلی کے وزیر برائے ٹرانسپورٹ جناب ہارون یوسف، اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس اور ممبر اسمبلی گوسوامی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ جن شعرائے کرام نے اس مشاعرہ جشن جمہوریت میں اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، حبیب ہاشمی، مظفر حنفی، ملک زادہ منظور احمد، معراج فیض آبادی، ڈاکٹر اسلم لہٰ آبادی۔ حق کانپوری، فاروق بخشی، ڈاکٹر نسیم نکہت، رضا امروہوی، ملکہ نسیم، نصرت گوالیاری، جوہر کانپوری، ڈاکٹر شفیع شیخ، نسیم عباسی، الطاف ضیا، شبینہ ادیب، ڈاکٹر عظیم امروہوی، فصیح اکمل قادری، ڈاکٹر نواز دیوبندی، ڈاکٹر شہپر رسول، فرحت احساس، ساغر وارثی، عزم شاکری، شمس تبریزی، ڈاکٹر فریاد آزر، متین امروہوی، اعجاز انصاری، شبانہ ندیم ضیائی، سلیم صدیقی، حنا تیموری، راشد حامدی، شمس رمزی، معین شاداب، ظفر جنگ پوری، اقبال اشہر، ڈاکٹر نزہت انجم، فخری میرٹھی، خورشید حیدر مظفر نگری اور اقبال فردوسی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

● حیدرآباد۔ 22 جنوری، ''اردو تلگو لٹریری فورم'' کے زیر اہتمام ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ اس ادبی اجلاس میں جہاں اردو، تلگو کے شاعروں، ادیبوں نے مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو کر اپنی تخلیقات پیش کیں وہیں اردو کا ترجمہ تلگو میں بھی پیش کیا گیا۔ یہ تجربہ ہماری ریاست میں ادبی و لسانی ہم آہنگی کے لیے خوش آئند اقدام ہے جس کے لیے ڈاکٹر قطب سرشار لائق تحسین و قابل مبارکباد ہیں جو اس فورم کے بانی وصدر ہیں۔ ڈاکٹر سرشار نے اردو میں تقریر کی۔ اپنی اردو غزل سنانے سے قبل کہا کہ غزل اگرچہ عربی اور فارسی زبانوں سے اردو زبان کا حصہ بنی اور اردو کو عالمی سطح پر مقبول عام کیا۔ اردو غزل اردو زبان کی پہچان ہے۔ ڈاکٹر سرشار نے بیسیوں تلگو تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مہمان خصوصی محمد رحیم الدین انصاری صدر اردو اکادمی اور تلگو لٹریری فورم کا یہ اجلاس ایک خوشگوار تہذیبی روایت کی شروعات ہے۔ صدر اجلاس پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ ''اردو تلگو لٹریری فورم'' ہماری گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کررہی ہے۔ تمثیل نگار جمیل شیدائی نے اردو شاعروں کا تعارف کروایا جبکہ سندریا نے تلگو میں تعارف کروایا۔ اجلاس میں اردو کے نامور شعرا مضطر مجاز اور علی ظہیر نے غزل اور نظمیں سنائیں۔ **(سیاست، حیدرآباد)**

● گورکھپور۔ 11 فروری، روزنامہ راشٹریہ سہارا گورکھپور کے ساتویں یوم تاسیس کے موقع پر مقامی اسلامیہ انٹر کالج آف کامرس کے سبزہ زار پر ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ مشاعرہ کا باضابطہ آغاز افضل منگلوری کی نعت پاک سے ہوا۔ سرد موسم کی پرواہ کیے بغیر اہل گورکھپور نے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے تمام شب موجود رہ کر شعرائے کرام کو داد و تحسین سے نوازا۔ مشاعرے کا یہ سفر جاری رہا اور اذان فجر سے قبل ایک ایسے مشاعرے کا اختتام ہوا جس نے گورکھپور کے تاریخی اور کامیاب ترین مشاعروں میں ایک نیا باب جوڑ دیا۔ مشاعرے کا وسیع وعریض پنڈال پرجوش سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اس مشاعرے میں منور رانا، شاعر جمالی، ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر کلیم قیصر، حامد بہرائچی، افضل منگلوری، ماجد دیوبندی، معین شاداب، نسیم نکہت، اچانک اور سنیل کمار تنگ کے کلام کو خاص طور پسند کیا گیا۔ **(راشٹریہ سہارا، دہلی)**

● دربھنگہ۔ 28 جنوری، ادبی انجمن ''بزم ادب'' اور ''دربھنگہ ٹائمس'' کے زیر اہتمام محلہ مہدولی (نزد قلعہ گھاٹ) دربھنگہ میں واقع مدرسہ معہد الانوار اصلاحی کے احاطے میں دربھنگہ کے ٹاؤن ڈی ایس پی ڈاکٹر پرویز اختر کے اعزاز میں شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر پرویز اختر کے علاوہ دربھنگہ کے ایڈیشنل کلکٹر محمد مسلم ضیا، مہمان خصوصی کے طور پر شامل تھے۔ پروگرام کی صدارت شمیم فاروقی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالودود قاسمی نے انجام دیے۔ پروگرام کے دوران ڈاکٹر پرویز اختر کے ذریعے ''پربھات واس فاؤنڈیشن'' کتب خانہ کا افتتاح کیا گیا، وہیں ادب کے میدان میں

پروفیسر جمال اویسی کو انجم رضوی ایوارڈ اور عطا عابدی کو شاداں فاروقی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مشاعرے میں عمدہ کلام پیش کرنے کے اعتراف میں جنید عالم آروی کو محسن دربھنگوی ایوارڈ اور منور عالم راہی کو عبدالعلیم آسی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات ابوبکر صدیقی کے تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ مشاعرے میں جن شعرائے کرام کے کلام زیادہ پسند کیے گئے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

شمیم فاروقی، ڈاکٹر پرویز اختر (ڈی ایس پی)، حسن امام درد، جمال اویسی، عطا عابدی، حیدر وارثی اور رفیق انجم۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● پونہ، اعظم کیمپس کے اسمبلی ہال میں استاد شاعر دلدار ہاشمی کی صدارت میں اسباق پبلی کیشن کا پہلا مشاعرہ درج ذیل مصرعوں پر کامیابی کے ساتھ انعقاد پذیر ہو چکا ہے:

جو بھی لمحہ ہے اسے شعر میں ڈھالا جائے

جتنے حسین خواب تھے آنکھوں میں مر گئے

دوسرا طرحی مشاعرہ انھی مصرعوں پر اسی اسمبلی ہال میں پونہ کے بزرگ شاعر جناب نور منیری کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرے کی ایک اہم خصوصیت یہ رہی کہ اس میں مدیر "اسباق" نذیر فتحپوری کے وسیع تر تعلقات کے زیر اثر کل ہند پیانے کے کئی شعرا کی شرکت نے اس بظاہر مقامی مشاعرے کو کل ہند مشاعرے کی شکل عطا کردی۔ ان نامور شعرائے کرام میں جوہر کانپوری، ڈاکٹر محبوب راہی، عبدالرحیم نشتر، تسنیم انصاری اور ارشاد احمد بڈھنیری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مدیر "اسباق" نذیر فتحپوری کی زیر نگرانی متین انصاری کی نظامت میں انعقاد پذیر اس مشاعرے میں اپنی طرحی غزلوں کے ساتھ درجہ ذیل شعرا نے اپنی انفرادیت پسندی اور تخلیقی جولانیوں کے نقوش سامعین کے دلوں پر مرتسم کیے۔ نور منیری، نذیر فتحپوری، دلدار ہاشمی، سید آصف، شبیہہ احسن کاظمی، اسلم چشتی، عالم فتحپوری، متین انصاری، حسام الدین شعلہ، لطیف جوہر، ادھو مہاجن بسمل، ڈاکٹر سید عقیل، تاج الدین تاج اور غلام دستگیر وغیرہ شعرا نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (سالار، بنگلور)

رسم اجرا

● نئی دہلی۔ 11 فروری، پروفیسر گوپی چند نارنگ دنیا کی ایک بڑی سیکولر زبان اردو کے ترجمان ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات سے اردو کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی 78 ویں سالگرہ کے موقعے پر ان کی زندگی اور علمی و ادبی کارناموں پر مشتمل "عالمی اردو ادب" کے خصوصی شمارے "گوپی چند نارنگ: بین الاقوامی شخصیت" کا اجرا کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر نارنگ کا سیکولر مزاج اور ان کی ذہنی کشادگی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں ان کی لمبی عمر کی دعا کرتا ہوں۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تمام اہل اردو اور "عالمی اردو ادب" کے مدیر نند کشور وکرم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو فقط اردو کا فیض ہے کہ مجھے ملک اور بیرون ملک ہر جگہ اتنی عزت اور توقیر ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان مزاجاً مشترک تہذیب میں گندھی ہوئی ہے اور سیکولرزم کا کوئی تصور اردو کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ "عالمی اردو ادب" کے مدیر نند کشور وکرم نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عالمی اردو ادب کا ہر شمارہ کسی نہ کسی بڑے فنکار پر ہوتا ہے۔ اس سے پہلے حبیب جالب، علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی پر میں خصوصی نمبر شائع کر چکا ہوں لیکن یہ شمارہ میری ادبی وصحافتی زندگی کا ایک بے مثال شمارہ ہے جسے منظر عالم پر لانا میرا ایک خواب تھا جو آج شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ اس موقعے پر چندر بھان خیال نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس تقریب میں محترمہ شیلا گجرال، پروفیسر ستیہ پال آنند، دیویندر اسر، کشمیری لال ذاکر، پروفیسر صادق، سریندر موہن، نصرت ظہیر، شاہد ماہلی، نرمل سنگھ نرمل، کے ایل نارنگ ساقی، مشرف عالم ذوقی، فاروق ارگلی، ظہیر احمد برنی، محترمہ منورما نارنگ، راکیش شریواستو اور متعدد علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

● نہرو سنٹر، ممبئی کا باوقار ادارہ ہے۔ سائنس کے علاوہ ادب و ثقافت کے فروغ میں بھی اس ادارے کی نمایاں حیثیت ہے۔ یہاں ہر ماہ کسی اہم کتاب پر مکالمہ بھی ہوتا ہے۔ اب تک 37 کتابوں پر مکالمہ ہو چکا ہے مگر ان میں کسی اردو کتاب کو شامل نہیں کیا گیا تھا پہلی مرتبہ ایک اردو کتاب پر مکالمے کی علمی مجلس "غالب اور ہماری تحریک آزادی" منعقد ہوئی جس میں اردو کی مشہور ادیبہ سلمٰی صدیقی، ممبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر صاحب علی اور روزنامہ "انقلاب" کے مدیر شاہد لطیف مدعو تھے۔ محقق شاعر اور صحافی شمیم طارق کی تصنیف "غالب اور ہماری تحریک آزادی" کا حال ہی میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

سب سے پہلے شاہد لطیف صاحب نے کتاب کے مشمولات پر بحث کی اور کہا کہ غالب کی زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جو پہلی مرتبہ سامنے آئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علی نے تمام ابواب کا الگ الگ تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان ابواب میں جو کچھ بھی ہے اتنا مدلل ہے کہ اختلاف کی ہمت نہیں ہوتی۔ سلمٰی صدیقی نے کہا کہ غالب اس عہد میں پیدا ہوئے جب دو عہدوں اور تہذیبوں میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ ہر طرف خون خرابہ تھا ایسے میں ایک مجتہد شاعر کیا کر سکتا تھا۔ غالب کی مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میں ضیم طارق نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں غالب کا مخالف نہیں ہوں میں غالب کا عاشق صادق ہوں۔ غالب کے عشق نے ہی مجھے یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا۔ اصل میں جو شخص جس سے عشق کرتا ہے، وہ اس کو ہر حیثیت سے مثالی دیکھنا چاہتا ہے۔ میں غالب کو صرف اردو کا اور ہندستان کا نہیں، ہر زبان اور ہر ملک کا اہم ترین شاعر مانتا ہوں۔ غالب کے بہت سے اشعار تو ایسے ہیں جن کے معنی وقت کے ساتھ منکشف ہو رہے ہیں مثال کے طور پر ان کا شعر ہے:

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس شعر کی اساتذہ اور سامعین نے تشریح کی ہے مگر جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوہر کا ایک مطلب (Atom) بھی ہے تو یہ شعر اور زیادہ با معنی ہو جاتا ہے یہ غالب کا کمال ہے کہ اس نے لفظوں کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا ہے اور ابھی اس کی شاعرانہ عظمت کا مکمل اعتراف نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ غالب نثر نگار بھی تھے وہ شاہان تیموریہ کے تاریخ نگار بھی تھے۔ انھوں نے 1857 کے حالات پر مشتمل روز نامچے لکھنے کا دعویٰ کیا تھا وہ ملکہ برطانیہ سے اعزاز و اکرام کی درخواست کرنے لگے تھے۔ اس وقت ان کی کوئی مجبوری نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ بہتر سے بہتر زندگی گزارنا چاہ رہے تھے۔

غالب کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ مغلیہ حکومت ایک بجھتا ہوا چراغ ہے مگر ان کو اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ یہ ملک 1857 کے 90 برس اور ان کے انتقال کے 78 برس بعد آزاد ہو جائے گا۔ (انقلاب، ممبئی)

● حیدرآباد۔ 10 جنوری، حضرت امجد حیدرآبادی کے شاگرد رشید مطیب حیدرآبادی کے اولین شعری مجموعہ "کلام مطیب" (مرتبہ جناب الیاس مطیبی) کی رسم اجرا سکندرآباد کے بزرگ شاعر جناب یوسف یکتا کے ہاتھوں 9 جنوری کی شام اردو ہال میں "بزم مطیب" کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب میں عمل میں آئی۔ ادبی اجلاس کی صدارت جناب صلاح الدین نیر نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر سید محمد بشیر احمد، ڈاکٹر خواجہ معین الدین اور جناب سید احمد اللہ حسینی شامل تھے۔ جناب شاغل ادیب، ناظم تقریب تھے۔ جناب الیاس مطیبی وفرزند مطیب حیدرآبادی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں بزم مطیب کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے بعد شرکائے تقریب کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے سے مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت جناب یوسف یکتا نے کی۔ مشاعرے میں یوسف یکتا، صلاح الدین نیر، شاغل ادیب، بصیر افضل، شوکت علی درد، الیاس مطیبی، یوسف الدین یوسف، یوسف روش، شکیل مظہر، مخدوم بنگلوری، سیدہ درجبین اور حبیب النسا صاحبہ نے کلام سنایا۔

(ڈاک سے)

مختصرات

● پٹنہ۔ 6 فروری، اردو زبان جس دن مرجائے گی اس دن یہ ملک مر جائے گا۔ جنگ آزادی میں ہندو مسلم کا جو گرم لہو بھارت کی سرزمین پر گرا آج اگر ہم اس لہو کو الگ کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے یہ باتیں ریاست کے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل برشن پٹیل نے پٹنہ کے گورنمنٹ اردو لائبریری کے زیر اہتمام ممتاز مجاہد آزادی اور گورنمنٹ اردو لائبریری کے بانی ڈاکٹر سید محمود کے حیات و خدمات پر منعقد سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔

اس موقع پر بہار کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشر نے سیمینار کا افتتاح کرنے کے بعد خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سید محمود کی پٹنہ میں اب تک کوئی یادگار قائم نہ کی جا سکی جس کا انھیں بے حد افسوس ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سید محمود بھارت کی جنگ آزادی کے صف اول کے مجاہد آزادی تھے۔ مہاتما گاندھی کے بہت قریبی ساتھی، پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ کانگریس کے جنرل سکریٹری بھی رہے ڈاکٹر سید محمود بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ سری بابو کے کابینہ میں تھے اور جواہر لال نہرو کی کابینہ میں بھی مرکزی وزیر مملکت برائے خارجہ تھے۔

ڈاکٹر سید محمود جنگ آزادی کا ایک درخشاں اور تابندہ ستارہ تھے۔ ان کی یاد میں اس لائبریری کا نام ڈاکٹر سید محمود لائبریری رکھا جائے۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا، برشن پٹیل اور ڈاکٹر مناظر حسن نے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری اور گورنمنٹ اردو لائبریری کے چیئرمین عبدالقیوم انصاری کو مبارکباد دی کہ انھوں نے بالکل پہلی مرتبہ ڈاکٹر سید محمود کی یاد میں اتنا شاندار سیمینار منعقد کیا۔

ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے ریاستی وزیر برشن پٹیل سے مطالبہ کیا کہ ہر اسکول کالج میں طلبہ رہیں یا نہ رہیں اردو کے اساتذہ بحال کیے جائیں۔ انجمن ترقی اردو سے کہا کہ اردو کی تحریک ایک بار پھر تیز کریں۔ اس موقع پر ڈاکٹر مناظر حسن نے کہا کہ ڈاکٹر سید محمود کی یاد میں اس طرح کا ایک سیمینار ہر سال منعقد کیا جائے۔

اس موقعے پر انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر سید محمود کو عظیم مجاہد آزادی بتاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ اردو سکھانے کا کام بھی کیا چنانچہ کستوربا گاندھی کو اردو سکھایا جس کا ذکر "مکتوب جواہر لعل نہرو" میں ملتا ہے۔ خلیق انجم نے مطالبہ کیا کہ پٹنہ کی کوئی اہم سڑک کو سید محمود کے نام کیا جائے اور اردو ہندی اور انگریزی میں ان کی حیات و خدمات پر کتاب لکھوائی جائے کیونکہ اتنی بڑی شخصیت پر باضابطہ کوئی کتاب نہیں ہے۔

اس موقعے پر انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری خلیق انجم کو پہلا ڈاکٹر سید محمود ایوارڈ برٹش پٹیل نے دیا اور انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری عبدالقیوم انصاری نے اعلان کیا کہ ہر سال ڈاکٹر سید محمود ایوارڈ دیا جائے گا۔ نازیہ اسلم کو میٹرک میں 75 فیصد نمبر حاصل کرنے کے لیے توصیفی سند و اعزاز محمد فضل کریم کو عربی ایم اے میں اول آنے پر نگار اعزاز، زرنگار یاسمین کو ایم اے اردو میں اول آنے پر مبارکباد دی۔ غزالہ ہاشمی کو ایم اے فارسی میں اول آنے پر "ہم نشین" کے صدر کہکشاں کے شکیل معین کو بہترین شاعری کے لیے اور تسنیم کوثر کو صحافت کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ سیمینار کی صدارت عبدالقیوم انصاری نے کی اور ریحان غنی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر ڈاکٹر آر ارشد اسری نے شکریے کی رسم ادا کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

● پٹنہ۔ یکم فروری، اردو ہندوستان کی زبان ہے یہ باہر سے نہیں آئی یہیں پلی بڑھی ہے۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی بے مثال علامت ہے، ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر ریل و راشٹریہ جنتا دل کے سپریمو لالو پرساد یادو نے غلام سرور میموریل سوسائٹی کی جانب سے منعقد "یوم اردو" تقریب کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام سرور نے اپنی پوری زندگی اردو کے فروغ اور مسلمانوں کے مسائل کے حل کی لڑائی میں وقف کر دی تھی۔ جے پی تحریک میں غلام سرور نے اہم رول ادا کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنی دور حکومت میں پوری ریاست میں اقلیتوں کے لیے تقریباً 19 اقلیتی ہوسٹل تعمیر کرائے۔ لیکن اب تک بہتوں کا افتتاح نہیں ہو پایا۔ انھوں نے اقلیتی کمیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس کمیشن کو آئینی درجہ دیا تھا۔ آج یہ کمیشن سرد مہری کا شکار ہے۔ انھوں نے غلام سرور کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ غلام سرور ایک بے باک صحافی اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ غلام سرور نے ہمیشہ اپنے دستوری حقوق کی حصولیابی کے لیے لڑائی لڑی۔

اس تقریب کی صدارت کر رہے راشٹریہ جنتا دل کے ریاستی صدر عبدالباری صدیقی نے کہا کہ زندہ قوم وہی ہے جو اپنے بزرگوں کو یاد کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ غلام سرور کسی خاص ذات، قوم کے لیڈر نہیں بلکہ وہ عوام کے لیڈر تھے۔ انھوں نے اردو کی لڑائی اس وقت تک لڑی جب تک کہ اردو کو اس کا صحیح درجہ نہ مل گیا۔ ریاست کے سابق وزیر شکیل احمد خان نے غلام سرور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک میں بہت کم اقلیت کے لیڈر ایسے ہوں گے جنھیں ایسے یاد کیا جاتا ہو۔ انھوں نے اپنی زندگی اردو تحریک کو کامیاب بنانے میں وقف کر دی تھی۔ آبی وسائل کے وزیر مملکت جے پرکاش یادو نے اردو کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اردو انقلاب اور شان کی زبان ہے۔

اس تقریب کے کنوینر غلام غوث نے مہمانان اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کارواں اردو اور ہندی کی بازیابی اور فروغ کے لیے تمام فرقے اور مذاہب کے لوگوں کو ساتھ لے کر زبان کی لڑائی لڑتا رہے گا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اس مادر وطن سے تعلق رکھنے والے تمام فرقے اور مذاہب کے لوگوں کا تعاون ضروری ہے۔

اس موقعے پر وزیر ریل لالو پرساد نے غلام سرور سوسائٹی کی جانب سے اردو تحریک کے مخلصین کے بیچ ایوارڈز تقسیم کیے۔ ان میں معصوم شرقی اسیر، امتیاز کریم، ماسٹر نسیم اختر صدیقی، مختار احمد عاصی وغیرہ کو محمد ایوب ایڈووکیٹ ایوارڈ، سید تقی رحیم ایوارڈ اور مولانا بیتاب صدیقی ایوارڈ اور رامائن سنگھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لالو یادو نے تمام لوگوں کو شال پیش کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس موقعے پر یونس لوہیا، حسن احمد قادری، نہال الدین، شمیم اختر، تنویر حسن اور الیاس حسین وغیرہ جیسے کئی اہم سیاسی لیڈران موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

● آگرہ۔ 11 فروری، نظیر اکبر آبادی کی یاد میں شاندار "نظیر بسنت میلہ" یہاں ان کے نام سے منسوب پارک اور مزار کے میدان میں منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز صبح 10 بجے اسکولی بچوں کی پربھات پھیری سے ہوا۔ مہمان خصوصی رام جی لال سمن ایم پی، ایم پی ڈاکٹر پربھا استھانہ، ڈاکٹر ششی تیواری، "بزم نظیر" کے صدر پیر زادہ عمر تیموری، سردار گربچن سنگھ وغیرہ نے ہندوستان کے اس عظیم عوامی شاعر نظیر کے مزار پر چادر پوشی کی اور بڑی تعداد میں مقامی فنکاروں، مصوروں، ادیبوں، سیاسی افراد، سماجی کارکنوں، طلبہ اور اساتذہ نے پروگرام میں شرکت کی۔ اپنے خصوصی خطاب میں ایم پی رام جی لال سمن نے کہا کہ نظیر ہندوستان کے واحد شاعر ہیں جن کا گہرا تعلق عوام اور عوامی معاملات سے رہا۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہے۔ "بزم نظیر" کے صدر عمر تیموری نے کہا کہ نگر نگم کے تعاون سے نظیر کے مزار پر شیڈ، فرش اور دیگر تعمیراتی کام کرائے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے "بزم نظیر" کے تمام اراکین ومعاونین اور آگرہ نگر نگم کے افسران اور دیگر سیاسی وسماجی شخصیات شکریے کے مستحق ہیں۔ ممبر اسمبلی ذوالفقار احمد بھٹو نے کہا کہ میاں نظیر کا پارک ان کے شایان شان بنایا جائے گا۔ اس کے لیے وہ بھرپور کوشش کریں گے۔ ذکیہ، شبنم، رجنی اور رما نے نظیر کا کلام سنایا۔ اس موقع پر پنچایت کی چیئرمین پریم وتی سمن نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت عارف تیموری نے کی۔ اخیر میں

ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت گربچن سنگھ نے اور نظامت کشش ایٹوی نے کی۔ شاہد ندیم، ڈاکٹر سرور مارہروی، سعید اللہ ماہر، بخشی اکبرآبادی، انور سلیم، ظہیر اکبرآبادی، انجم اکبرآبادی، شرافت علی پرواز اور رئیس احمد رئیس نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● جودھپور۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی کے تعاون سے سردکار، بزمِ اردو، انوراودھا آرٹس اور امکانِ ادب، جودھپور کے زیرِ اہتمام مشہور شاعر، افسانہ نگار اور نغمہ نگار گلزار کے ساتھ ''واحد شاعر پروگرام'' کا انعقاد کیا گیا جس میں گلزار نے اپنی نظمیں، تربینیاں اور غزلیں سنا کر ٹھٹھرتی ہوئی شام کو حرارت بخشی۔ ہوٹل سری رام انٹرنیشنل میں ہوئے اس پروگرام میں ''آؤ پھر نظم کہیں'' سے آغاز کرتے ہوئے گلزار نے ''کندھے جب جھک جاتے ہیں'' اور دیگر نظمیں سنا کر سامعین سے خوب داد حاصل کی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ سب سے بڑا مورخ ادیب ہے کیونکہ وہ عوام کی زندگی لکھتا ہے۔ ادیب ایک دور کو جمع اور محفوظ کرلیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں روزمرّہ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور فن کے تئیں ایماندار ہوں۔ فلموں سے مجھے پہچان ضرور ملی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ لوگوں کو میرے شعر اچھے لگے اس لیے وہ فلم برداشت کرتے ہیں۔

پروگرام کے آغاز میں شین کاف نظام نے گلزار کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''گلزار نہ تو سرمایہ داروں کے نہ ہی غریبوں کے بلکہ مڈل کلاس لوگوں کے شاعر ہیں۔ گلزار کے یہاں انکساری ہے، تصنع نہیں اور یہ ان کی زندگی کا جز ہے۔ جس طرح میر کے یہاں دل دلی ہوجاتا ہے ویسے ہی گلزار کے یہاں دل خدا ہوجاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گلزار کی زندگی کے دو پہلو ہیں: فلمی اور علمی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان کے ایک چہرے کو ہی جانتے ہیں جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ ان کے علمی چہرے کو بھی خاطر خواہ توجہ سے پہچاننے کی کوشش کریں۔

اس سے قبل مومنٹو، شال اور صافہ کے ذریعے گلزار کا استقبال کیا گیا۔ پروگرام میں اردو، ہندی اور راجستھانی کے شعرا، ادبا اور شہر کے معزز افراد موجود تھے۔ (ڈاک سے)

● بزمِ جگر، مہسی مشرقی چمپارن اور انجمن ترقی اردو ترہت ڈویژن نے مشترکہ طور پر گذشتہ 11 جنوری کو چمپارن کے مجاہد آزادی اور ''شب چراغ'' کے مصنف شہادت حسین جگر مہسوی کے یوم پیدائش کا انعقاد انجمن ترقی اردو ترہت ڈویژن کے آفس حاجی مارکیٹ بارا چکیا میں کیا۔ تقریب کی صدارت ہندی کے شاعر اور چمپارن کے معمر صحافی جناب یوگیندر ناتھ شرما نے کی جبکہ اسپورٹس جرنلسٹ جناب ضحیٰ افضل نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انجمن ترقی اردو ترہت ڈویژن کے آرگنائزر شکیل شاغل نے کہا کہ چمپارن کی مردم خیز بستی دھمر پور میں 11 جنوری 1921 کو شہادت حسین جگر مہسوی نے اس دارفانی میں قدم رکھا اور غلامی کی زنجیروں میں ملک کو قید پایا۔ اس احساس نے ان کے اندر آزادی کی تڑپ پیدا کردی اور وہ 1942 میں ''انگریز بھارت چھوڑو تحریک'' میں شامل ہوگئے۔ تحریک میں سرگرم رہتے ہوئے انھوں نے مہسی میں بم بلاسٹ کرکے برطانوی حکومت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ انگریزوں نے پہلے ان کی گرفتاری کا وارنٹ اور پھر گولی مارنے کا آرڈر جاری کیا مگر وہ انگریزوں کے ہاتھ نہ آئے اور روپوش ہوکر متواتر تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ جب 1947 میں ملک آزاد ہوا تو وہ بھی آزاد فضا میں باہر آئے اور اپنے خونِ جگر سے اردو ادب کی آبیاری کرتے کرتے 20 اکتوبر 2002 کو مالک حقیقی سے جا ملے۔ بھارت چھوڑو تحریک میں یہ شعر ان کے ورد زباں رہتا تھا:

''ہماری جان جاتی ہے تو جائے ـــ وطن کی آبرو جانے نہ پائے''

جگر مہسوی یوم پیدائش کی تقریب میں علاقے کے ادبا اور شعرا نے شرکت کی۔ جن شعرا کا کلام پسند کیا گیا ان میں ڈاکٹر محمد حاتم جاوید، لکشمن احساس، احسان علی احسان، محبوب حسین مہر نوادوی، آنند موہن جھا، یوگیندر ناتھ شرما، ششی رنجن ششی، نجیب الرحمٰن اور سید شاہنواز شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد۔ 29 دسمبر، اصغر ویلوری مدراس کے کہنہ مشق شاعر ہیں اور ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن صنف رباعی کی جانب زیادہ متوجہ ہیں اور اسی لیے عصرِ حاضر کے شعری منظرنامے میں رباعی گو کی حیثیت سے اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں ان کے چھ شعری مجموعے شائع ہوکر اردو دنیا میں پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے فن و شخصیت سے متعلق بھی کئی تالیفات منظر عام پر آئی ہیں۔ یہ تاثرات ان دانشوروں کے تھے جنھوں نے ادارہ ''نیرنگ ادب'' کی تہنیتی تقریب کو مخاطب کیا تھا جو بہ تعاون ''بزم یکتا'' 26 دسمبر کی شام مشیرآباد میں اصغر ویلوری کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھیں۔ ادبی اجلاس کی صدارت صلاح الدین نیر نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر راہی، اثر غوری، ڈاکٹر سید محمد بشیر احمد اور ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ثانی شامل تھے۔ یوسف روش نے تہنیتی قطعات سنائے۔ مہمان شاعر اور صدر اجلاس کی ادارہ نیرنگ ادب، بزم یکتا اور بزم جوہر کی جانب سے گل پوشی اور شال پوشی کی گئی۔ بعد ازاں منعقدہ مشاعرے کی صدارت یوسف یکتا نے کی۔ مشاعرے میں یوسف یکتا، صلاح الدین نیر، اصغر ویلوری، شاغل ادیب، اثر غوری، ڈاکٹر محسن جلگانوی، فیض الحسن خیال، ڈاکٹر راہی، بصیر افضل، شوکت علی درد، قدیر انصاری، مسعود جاوید ہاشمی، یوسف روش اور مخدوم بنگلوری نے کلام سنایا۔ (ڈاک سے)

وفیات

• پٹنہ۔ 12 فروری، معروف جدید شاعر پرکاش فکری کا طویل بیماری کے بعد صبح ساڑھے چار بجے رانچی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 77 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ ریاست ہریانہ کے انبالہ میں 2 اگست 1931 کو پرکاش فکری کی پیدائش ہوئی، جہاں ان کے والد مولوی محمد زکریا ایک اسکول میں عربی کے استاد تھے۔ نئے لہجے اور پیکروں کے سبب پرکاش فکری، جن کا اصل نام ظہیر الحق تھا، نے قارئین کی توجہ کھینچی۔ 1960 سے ان کی غزلیں ہندو پاک کے معتبر رسائل و جرائد میں اہتمام سے شائع ہونے لگی تھیں۔ جدید غزل کے تعلق سے شاید ہی کوئی اہم مضمون یا کتاب ہو، جس میں پرکاش فکری کے اشعار شامل نہیں کیے گئے ہوں۔ ان کے دو شعری مجموعے، ''سفر ستارہ'' اور ''اک ذرا سی بارش'' شائع ہوچکے ہیں۔ جن میں ان کا منتخب کلام موجود ہے۔ رسالہ 'تحریک' میں 'رف نوٹس' اور دوسرے رسائل میں 'ٹیبل ٹاک' عنوان سے انھوں نے مختصر ادبی مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا جن میں ادب کے تعلق سے حالات حاضرہ پر چبھتے ہوئے تبصرے ہوتے تھے۔ امرت لال ناگر کے ناول 'امرت اور وش' کا انھوں نے ہندی میں ترجمہ کیا تھا، جس پر ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انھیں ترجمے کا انعام عطا کیا گیا۔ ان کی وفات سے اردو دنیا میں خلا محسوس کی جارہی ہے۔

منظور ہاشمی

• علی گڑھ۔ 6 فروری، ممتاز شاعر منظور ہاشمی کی وفات پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر خورشید احمد نے انجام دیے۔ اپنے تمہیدی کلمات میں انھوں نے منظور ہاشمی سے اپنے نجی مراسم اور گہرے تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ اہمیت پر اجمالی تبصرہ بھی کیا نیز ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کلمات خیر ادا کیے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنی مختصر تقریر میں بحیثیت انسان منظور ہاشمی کی عادتوں اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ انسان دوستی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ راحت حسن نے منظور ہاشمی کو غزل کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے اشعار میں مرحوم کے شعری سفر کے اچانک خاتمے پر غم اور گہرے قلبی لگاؤ کی آنچ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ ڈاکٹر راشد انور راشد نے اپنے مختصر مضمون میں ان کی رحلت پر درد و غم کے اظہار کے علاوہ ان کی شاعری کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے خصوصی طور پر غزل کے حوالے سے ان کی صاف ستھری اور سلیس زبان اور موضوعات کے تنوع پر گفتگو فرمائی۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب نے تعزیتی قرارداد پیش کی جس میں مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کے تخلیقی و شعری سفر کا مکمل احاطہ کیا گیا تھا۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ان کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے شعبۂ اردو سے ان کی گہری وابستگی کی تفصیل پیش کی۔ اس موقعے پر مرحوم کے اہل خانہ، اعزا و اقارب اور رفقا خاص بھی موجود تھے۔ منظور ہاشمی کی پیدائش 14 ستمبر 1932 کو بدایوں میں ہوئی، بدایوں اور بریلی سے انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1963 میں پروفیشنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا۔ 1978 میں مولانا آزاد لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدے پر اور 1989 میں ڈپٹی لائبریرین کی حیثیت سے ذمے داریاں انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تین شعری مجموعے ''بارش'' (1981)، 'آب' (1994) اور 'سخن آباد' (2005) اردو دنیا کے حوالے کیا۔ 'بارش' کو ساہتیہ اکادمی اترپردیش کی جانب سے انعام سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں ایک مجموعہ 'پھولوں کی کشتیاں' کے نام سے 2006 میں شائع ہوا۔ آپ کا کلام ملک کے مقتدر رسالوں میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ موضوعات کا تنوع، عصری آگہی، فطرت سے لگاؤ شدت احساس اور سادہ بیان آپ کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں جس سے آپ نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

• نئی دہلی۔ 6 فروری، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ہومنیٹیز اینڈ لینگویجز میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی نے کہا کہ مولانا کا علمی سفر بہت طویل ہے۔ ان کے بیشتر تحقیقی مضامین مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ نشست میں پروفیسر عماد الدین، پروفیسر فرحانہ صدیقی، پروفیسر خالد حامدی، پروفیسر ایوب محمد تاج الدین وغیرہ نے شرکت کی۔ دوسری جانب ایڈورڈ سعید ہال میں منعقد ایک اجلاس میں صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر اختر الواسع نے تعزیتی قرارداد میں کہا کہ مولانا نے 71 سال کی عمر پائی اور ان کا تعلق مردم خیز خطہ اعظم گڑھ سے تھا۔ ان دنوں مولانا شبلی اکادمی کے ڈائرکٹر تھے اور مدرستہ الاصلاح کے ناظم، مولانا کے سانحہ ارتحال سے علم و ادب کا ایک روشن باب ختم ہوگیا۔

مولانا انعام الرحمٰن تھانوی

● سہارنپور۔ 4 فروری، مدرسہ مظاہر علوم کے سینئر استاد اور مدرسہ کے ترجمان ''آئینہ مظاہر علوم'' کے سابق مدیر، اردو اور فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز ادیب حضرت مولانا انعام الرحمٰن تھانوی رحلت فرما گئے۔ ان کی عمر 93 سال تھی پسماندگان میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ مرحوم گذشتہ 50 سال سے مدرسہ مظاہر علوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے علاوہ شعبۂ تنظیم و ترقی کے بھی ناظم رہے۔ تاریخی نام نکالنے میں مہارت رکھتے تھے۔ نماز جنازہ ان کے شاگرد رشید شہر قاضی سلطان اختر نے پڑھائی۔ کل دیر شام تکیہ قطب شیر میں تدفین ہوئی۔ جنازہ میں مدرسہ کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد سعیدی کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ و ملازمین، سرکردہ سیاسی اور سماجی شخصیات کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ہجوم شامل تھا۔

● ممبئی۔ ''اعتراف گروپ''، ممبئی ڈاکٹر رام پنڈت، اسلم پرویز اور وقار قادری اور ندا فاضلی نمبر کے بعد ''اقبال مجید نمبر'' شائع کرنے جا رہا ہے جس کے مرتب اسلم پرویز ہوں گے۔ اگر آپ کے پاس اقبال مجید کے اہم ادبی خطوط محفوظ ہوں تو براہ کرم ان کی ایک نقل ارسال کریں۔ قابل اشاعت ہونے پر شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

آئندہ شمارہ مخدوم محی الدین نمبر ہوگا

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

تبصرہ و تعارف

●واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات

مصنف: کوکب قدر سجاد علی میرزا

صفحات: 688، **قیمت:** 97 روپئے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی ۔66

مبصر: ابوبکر عباد، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل، نئی دہلی

ہٹلر کے ساتھی جرمن فلاسفر گوئبلز کا مشہور فلسفہ ہے کہ جھوٹ کو اس قدر تواتر کے ساتھ دہراؤ کہ اس پر سچ کا گمان گزرنے لگے۔ اس مذموم فلسفے پر عمل کرنے والوں کی حالیہ اور سب سے بڑی مثال امریکی حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کی ہے۔ 24 جنوری 2008 کے ایشین ایج، دی ہندو اور دوسرے قومی اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے علاوہ سینٹر فار پبلک انٹیگریٹی کی ویب سائٹ پر ''فنڈ فار انڈیپنڈنس ان جرنلزم'' کی مطالعاتی رپورٹ موجود ہے جس میں مذکورہ اداروں (سینٹر فار پبلک انٹیگریٹی اور فنڈ فار انڈیپنڈنس ان جرنلزم) نے اپنے ریسرچ میں یہ ثابت کیا ہے کہ عراق پر حملہ کرنے سے قبل دو سال کی مدت میں عراق کے خلاف امریکی اہلکاروں نے 935 جھوٹ بولے ہیں۔ عراق میں عوامی تباہی کے ہتھیار اور عراق کے ساتھ القاعدہ کے رابطے سے متعلق 259 جھوٹے بیانات امریکہ کے صدر جارج بش نے دیے۔ اور ان کے وزیر خارجہ کولن پاویل نے 254 جھوٹے بیانات جاری کیے۔ ان کے علاوہ امریکی نائب صدر ڈک چینی، اس وقت کے قومی سیکورٹی کی صلاح کار کنڈولیزا رائس، وزیر دفاع رمسفیلڈ اور وہائٹ ہاؤس کے پریس سکریٹری ایری فشر اور اسکاٹ میک کلین وغیرہ نے بھی اس قدر اور اس تواتر سے جھوٹ بولے کہ دنیا کے بیشتر ممالک نے اس جھوٹ کو سچ تسلیم کیا اور عراق پر حملہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ اس عجلت سے دیا کہ اگر فوری طور پر عراق کی حکومت ختم نہ کی گئی تو باقی تمام دنیا اس کے مہلک ہتھیاروں سے فنا ہو جائے گی۔

جھوٹ کے اس فلسفے کے ذریعے حق کو باطل، اچھے کو برا اور معروف شخصیتوں کو مطعون بنانے کی مثالیں تاریخ کے صفحات میں جا بہ جا مل جائیں گی۔ اورنگ زیب عالمگیر، بہادر شاہ ظفر اور نواب واجد علی شاہ کی مثالیں سامنے کی ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مغربی میڈیا نے مذہب اسلام، مسلمان اور مسلمانوں کے دینی اور قومی رہنماؤں سے متعلق ایسے ایسے جھوٹ تراش کر انھیں سچ باور کروایا ہے کہ ہم اپنے ہی سرمایے اور اپنے اسلاف و اکابر کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے اور یاد کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال نواب واجد علی شاہ کی ہے۔ ایک باصلاحیت، باتدبیر، منتظم کار، امور سلطنت کے ماہر، علمی، ادبی اور فنی خوبیوں سے مزین تہذیب و ثقافت کے حامی، اپنی مملکت اور رعایا کا حد درجہ خیال رکھنے والے بادشاہ سے متعلق اس کی قوم کے پاس جو معلومات ہیں وہ یہ کہ واجد علی شاہ ایک عیاش، اوباش اور ناچنے گانے والا نواب تھا، جس کے نکمے پن کی وجہ سے اس کی سلطنت اس کے ہاتھوں سے جاتی رہی۔ سراج الدولہ تو ایسا نہیں تھا، سلطان ٹیپو ایسے نہیں تھے، صدام حسین بھی ایسا نہ تھا کیوں گئیں ان کی حکومتیں؟ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں اب تک بغیر سوچے سمجھے اور حقائق کا پتہ لگائے بغیر واجد علی شاہ کی تعریف یا مذمت کی جاتی رہی ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد لازم ہے کہ ان کے افکار و اعمال کا مطالعہ کیا جائے اور ان سے متعلق صحیح حقائق کا علم حاصل کیا جائے۔

گوکہ واجد علی شاہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے ان کی سیاسی اور ذاتی زندگی کا مطالعہ ناگزیر ہے لیکن موضوع کی تحدید کے باعث ان دونوں حیثیتوں سے قطع نظر مصنف نے اپنی توجہ محض ان کی ادبی اور ثقافتی خدمات پر مرکوز رکھی ہے۔ 688 صفحات کی یہ ضخیم کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب کا عنوان، ''پس و پیش'' ہے، اس باب میں واجد علی شاہ کے عروج و زوال اور ان کی خدمات پر اس عہد کی سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی تحریکوں کے اثرات کے جائزے کے علاوہ ان کے معزول ہونے اور ان کی وفات کے بعد کے چند اہم واقعات کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ان کی سوانح سے متعلق ہے۔ اس حصے میں ان کی ولادت، خاندان، تعلیم، ازدواج، اولاد، ولی عہدی، شاہی، معزولی، نظر بندی، جلاوطنی اور وفات وغیرہ سے متعلق مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ یہ باب اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس میں واجد علی شاہ کی تمام تصنیفات اور ان کے بیانات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جنھیں اب تک لوگ بغیر دلیل کے تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس باب کے تیسرے فصل میں واجد علی شاہ کی بیالیس تصنیفات کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور چند نایاب کتابوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔

چوتھا باب ثقافتی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصے میں واجد علی شاہ کی ثقافتی سرگرمیوں کو بہت ہی مربوط اور منظم طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح واجد علی شاہ نے اپنے عہد کی

موسیقی، رقص، شاعری، معماری، مصوری، باغبانی نیچرل ہسٹری، خطاطی اور لباس وغیرہ کی روایتوں کو ترقی دی۔ اس باب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کس طرح رہس کے خدوخال مرتب کیے اور اسے کس طور انگریزی اثرات سے محفوظ رکھا۔ پانچواں اور آخری باب دوفصلوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل میں واجد علی شاہ کی نثر نگاری سے بحث کی گئی ہے اور دوسری فصل میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خطوں میں مکالماتی اسلوب اور مثنویوں میں ڈرامائی طرز ادا ان کی ادبی شناخت قرار پاتی ہے۔ اس باب کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ جن خطوں کو آج تک بیگماتی زبان اور نسوانی جذبات کی عکاسی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا رہا ہے وہ تمام خط دراصل اس عہد کے اوسط درجے کے ادیبوں کے تحریر کردہ ہیں، کہ بیگمات بالعموم لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھیں۔

کوکب قدر صاحب نے یہ کتاب لکھ کر بڑی دیانتداری سے تحقیق کا حق ادا کیا ہے، انھوں نے انتہائی غیر جانبداری سے واجد علی شاہ کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا ہے اور لکھنویت کے بعض منفی اثرات کا صدق دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ واجد علی شاہ اور ان کے عہد سے متعلق کئی کتابیں لکھی گئی ہیں بالخصوص ابواللیث صدیقی کی کتاب ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' پروفیسر مسعود حسن رضوی کی کتاب '' لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' اور انگریزی میں ڈاکٹر جی۔ ڈی بھٹناگر کی کتاب Administration of Awadh under wajid ali shah وغیرہ لیکن کوکب قدر سجاد علی میرزا کی مذکورہ کتاب اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں میں یوں زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس کی حیثیت بہر طور تحقیق مزید کی ہے۔ پھر یہ کہ کوکب قدر صاحب کا تعلق نواب واجد علی شاہ کے خانوادے سے ہے۔ یہ کتاب واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات کی روداد اور بیان حقائق کے استناد کا درجہ تو رکھتی ہی ہے لکھنؤ کے اس عہد کی تاریخ بھی ہے جس کے نمائندہ واجد علی شاہ تھے۔

● امریکی ادب کا مختصر جائزہ

مصنف: سلامت اللہ خاں

صفحات: 192، قیمت: 52 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: ابوشہیم خاں J3A/28A، کمرشی اکسٹنشن، مالویہ نگر، نئی دہلی-17

''امریکی ادب کا مختصر جائزہ'' سلامت اللہ خاں کی تاریخی و تجزیاتی نوعیت کی کتاب ہے جس میں امریکی ادب کے تاریخی و ثقافتی سیاق و سباق کی وضاحت کی گئی ہے نیز وہاں کی ہر ادبی تحریک پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف تحریکوں کا باہمی رشتہ یا ایک دوسرے پر ان کا ردعمل اور ان تحریکوں کے نمائندہ ادیبوں اور ان کے شہ پاروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''امریکی ثقافتی میراث'' ہے جس میں امریکہ میں نوآبادیات قائم کرنے والوں اور عیسائیت کے مبلغوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی تحریروں سے امریکی ثقافت پر پڑنے والے دور رس اثرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ خاص طور پر سترھویں صدی کے میتھر خاندان کی تین پشتوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں پادری جو ناتھن ایڈورڈس کا بھی ذکر ہے جو ایک بڑے عالم، فلسفی، صوفی، منطقی اور سائنسداں تھے، ان کی تمام دستیاب تحریروں (پانچ تصانیف) پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ گرچہ ان کی تمام تر تصانیف کا تعلق خیر وشر کی تفاصیل اور ثقافتی روایات سے ہے لیکن امریکی تخلیقی ادب کو بھی انھوں نے متاثر کیا۔ امریکی ادب میں ان اثرات کی بازگشت کو مصنف نے بخوبی اجاگر کیا ہے جو ناتھن ایڈورڈس کے بعد روشن خیالی کے علم بردار، عملیت کے ہیرو اور حریت پسند بنجامن فرینکلن کی خدمات اور ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا محاسبہ کیا گیا ہے۔

امریکہ میں نوآبادیات کے خلاف جنگ کرنے والوں نیز امریکی جمہوریت کے معماروں میں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے تھامس جیفرسن سب سے نمایاں ہیں۔ ان کی کتاب "Common Sense" امریکی زندگی کا تہذیبی وثقافتی مرقعہ ہے، ان کی خدمات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ''بدیع امریکی ادب اور رومانیت'' ہے۔ امریکہ میں حصول آزادی کے بعد برطانوی اور یورپی ادب کے اثرات سے پاک، منفرد مقامیت کا اظہار جون ٹرمبل، فلپ فرینو اور جوئیل بارلو کی شاعری میں ہوتا ہے۔ ان تینوں شعرا کا ذکر ان کی مخصوص نظموں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ شاعری کی طرح تخلیقی نثر میں بھی قومی مواد کو برتا گیا ہے۔ ولیم ہل براؤن، سوزان روسن اور ہنا فاسٹر کے ناول اس رجحان کے نمائندہ ناول ہیں جن کا ذکر یہاں موجود ہے۔

سیاسی آزادی کے حصول اور قومی شعور کی بیداری کے ساتھ امریکی ادب میں نوکلاسیکی ہیئت پرستی اور عقلیت مخالف رومانیت وجود میں آئی جس میں انفرادیت اور تخیل کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور مادّے کے مقابلے میں ادراک کو زیادہ اعتبار حاصل تھا۔ اس تحریک کے علم برداروں میں واشنگٹن ارونگ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی تمام نگارشات کا تفصیلی جائزہ اس باب میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ اس تحریک سے وابستہ جیمس فینی مور کوپر کے مختلف ناولوں، ولیم کلن برائنٹ کے چاروں شعری مجموعوں اور تنقیدی مضامین پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور رومانیت کے فروغ میں ان کی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ رومانیت کی توسیع کے حوالے سے رالف والڈوایمرسن اور ہنری ڈیوڈ تھورو اوران کی خدمات کی جانب بھی اشارہ

کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ''رومانیت کا بحران اور فن کی تجدید'' ہے۔ امریکی انقلاب سے انسان کے مستقبل کی جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں اور سماج میں رفتہ رفتہ انتشار و افراتفری درآئی۔ خود انسان کا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے رجائیت اور موضوعیت کے دعوے کھوکھلے نظر آنے لگے۔ اس طرح امریکی ادب میں تجسس اور تشکیک کا دور شروع ہوا۔ ایڈگر ایلن پو، نتھانیل ہاتھورن اور ہرمان میلول اس دور کے نمائندہ لکھنے والے تھے۔ انھوں نے مروجہ رجحانات سے انحراف کیا جس کا بیان اس باب میں کیا گیا ہے۔ ان تینوں قلمکاروں نے فلسفۂ موضوعیت اور اس کی رجائیت سے انحراف کیا اور اس پر نکتہ چینی کی لیکن والٹ وھٹ مین نے موضوعیت سے استفادہ کیا اور اس کی توسیع کی۔ اسی طرح نظم معریٰ، شاعری میں موسیقیت کے استعمال، جنسیات پر آزادانہ اظہار خیال اور اشاریت نگاری پر ان کے اصرار کا بھی ذکر ہے۔ ضمناً تین رجعت پسندوں لانگ فیلو، لوویل اور ہومس کی شاعری کا بھی ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔

چوتھا باب ''علاقائی حقیقت نگاری اور ادبی و اخلاقی قدروں کی تجدید'' ہے۔ خانہ جنگی کے بعد جب اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدا میں ملک بھر میں تعلیمی ادارے کھلے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے صنعت و حرفت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، نئی نئی صنعتیں قائم ہوئیں، معدنیات کی دریافت کی کوششیں ہوئیں اور امریکہ میں قومیت کا دور دورہ شروع ہوا تو قلمکاروں نے بھی نظریاتی مباحث سے ہٹ کر ملک کی داخلی اور علاقائی زندگی کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ تخیل اور عینیت کی جگہ حقیقت پسندی اور ارضیت نے لے لی۔ ادیبوں نے عام زندگی اور عام آدمی کو اپنا موضوع بنایا اور امریکی ادب میں علاقائی حقیقت نگاری کی ابتدا ہوئی۔ اس سلسلے کے ادیبوں میں پہلا نام مشہور مصنف ولیم ڈین ہوولس کا ہے۔ اگرچہ ہوولس نے تیس سے زیادہ ناول، لاتعداد کہانیاں، اکتیس ڈرامے، مختلف سفرنامے، کئی جلدوں پر مشتمل خود نوشت سوانح عمری اور نظموں کے تین مجموعے قلمبند کیے لیکن ان کی شہرت کے ضامن ان کے چار سماجی ناول ہیں جن میں انھوں نے ہم عصر سماجی مسائل کا ہمدردانہ اور غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا ہے لیکن صاحب کتاب نے ان کے صرف ایک ناول "A Modern Instance" کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ دوسرے مصنفین میں مارک ٹوین اور ہنری جیمس کا تفصیلی ذکر بھی شامل ہے۔

پانچواں باب ''رومانیت کا انحطاط اور نیچریت کی ابتدا'' ہے۔ اس باب میں پہلے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں رومانیت کے زوال کے اسباب کا بیان ہے۔ اس کے بعد اس ادبی خلا کو پر کرنے کے لیے نیچریت (Naturalism) کی ادبی تحریک کی ابتدا کا ذکر ہے نیز اس کے پس پشت کارفرما مختلف عوامل، رومانیت اور نیچریت کے مابین فرق اور ان کے نمائندہ ادیبوں کا ذکر اس باب میں شامل ہے۔ نیچریت کے نمائندہ ادیبوں میں مصنف نے ہیملن گارلینڈ، فرینک نورس، اسٹیون کرین اور جیک لنڈن وغیرہ کو شامل کیا ہے اور فرداً فرداً ان کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور ان کے مابین مماثلتوں اور اختلافات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

چھٹا باب ''ہزیمت خوردہ نسل کے پیش رو'' اور ساتواں باب ''ہزیمت خوردہ نسل: پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیانی وقفے میں'' ہے۔

چھٹے باب میں بیسویں صدی کی مختلف و متنوع ادبی تحریکوں کا تعارف ہے۔ نیچریت کی عارضی آب و تاب اور پھر اس کے احیا کے اسباب و علل کا بیان ہے۔ مختلف رجحانات سے وابستہ ادیبوں کے سوانحی کوائف اور ان کی کتابوں کا ذکر ہے۔ جن ادیبوں کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے ان میں ایڈیتھ وہارٹن، ایلن گلاسگو، ولاکیتھر تھیوڈور ڈرائزر، ایڈگر لی کارل سینڈ برگ، رابرٹ فراسٹ شامل ہیں۔ جب کہ ساتویں باب میں بتایا گیا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں انسانیت کے تحفظ کے پس پردہ ہونے والی بربریت، ریاکارانہ بے رحمی اور جنگی صنعتوں سے نفع اندوزی کی سیاست ادیبوں پر منکشف ہوئی تو ادیبوں کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو ہزیمت خوردہ اور مایوس نسل سے تعبیر کیا اور اپنی تحریروں میں راست گوئی سے اس کا اظہار کیا۔ ٹی. ایس. ایلیٹ، ایزرا پاؤنڈ وغیرہ اس رجحان کے نمائندہ علم بردار تھے جن کی تصانیف کا مصنف نے اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔

آٹھواں اور آخری باب ''جدید امریکی ادب کے رجحانات: دوسری جنگ عظیم کے بعد'' ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی جب امریکہ میں امن و سکون کی جگہ باہمی تناؤ، اقتصادی رقابت، بے چینی، بے اطمینانی اور گھبراہٹ نے لے لی اور دنیا دو مختلف کیمپوں میں بٹ کر سرد جنگ میں ملوث ہوگئی تو مکمل تباہی کے امکانات نے عام لوگوں کے ساتھ ادیبوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ ذہنی کشمکش اور اضطراب کے اس عالم میں ادیب بھی (خود امریکہ کے اندر) کئی خانوں اور کیمپوں میں بٹ گئے لیکن ان سب کے درمیان ایک قدر مشترک بھی تھی: انسان اور انسانیت کے مستقبل کی فکر۔ جن ادیبوں اور شاعروں کا اس ذیل میں ذکر کیا گیا ہے ان میں تھیوڈور ادھکے، رچرڈ ولبور، رابرٹ لوویل بیٹ تحریک کے معمار ایلن گنسبرگ اور ناول نگار جیک کرویک، جے. ڈی. سیلنجر، آرتھر ملر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کتاب امریکہ کی ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک گرانقدر معلوماتی کتاب ہے جو مختلف ادوار میں قلمکاروں کے مختلف ذہنی رویوں، امریکی ادبی روایات،

ادبی میلانات و رجحانات اور ان رجحانات کے نمائندہ قلم کاروں کی تجزیاتی تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ بعض مقامات پر مصنف کے دعوے کے برخلاف اس پر ترجمہ کا گمان ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ ایک قابل قدر کاوش ہے اور اردو میں امریکی ادب کے بارے میں اہم معلومات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

● تاریخ آصفی

مصنف: مرزا ابوطالب اصفہانی

صفحات: 189، **قیمت:** 58 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: ظفر احمد نظامی، 164، ذاکر باغ، اوکھلا، نئی دہلی۔110025

پیش نظر کتاب ''تفضیح الغافلین'' (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے جو تاریخ آصفی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مصنف مرزا ابوطالب اصفہانی فارسی زبان کے زبردست عالم اور ادیب ہونے کے علاوہ تاریخ و سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان میں جن شخصیتوں نے ناموری حاصل کی ان میں ابوطالب کی شخصیت نہایت اہم ہے۔ انھوں نے یورپ اور بعض ایشیائی ممالک کی سیاحت بھی کی اور کافی عرصے تک انگلستان میں قیام کیا۔ انھوں نے ''سیر طالبی'' کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا تھا جو فارسی زبان میں تھا اور جو یورپ کی کئی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

''تفضیح الغافلین'' اودھ کے آصف الدولہ کے عہد کی تاریخ ہے جو اودھ اور لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جیسا کہ پروفیسر عرفان حبیب نے لکھا ہے کہ ''ہندوستانی تاریخ کے طلبہ کے اولین فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے علاقے کی تالیفات فراہم کر کے ان کو باقاعدہ مرتب کریں اور پھر ترجمہ کریں نیز ان کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش کریں۔'' ڈاکٹر ثروت علی نے اودھ سے متعلق تمام تصانیف کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں یورپ کے کتب خانوں سے حاصل کر کے ابوطالب اصفہانی کے حالات اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ قلمبند کیا جس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری سے سرفراز کیا۔

مترجم نے ''تاریخ آصفی'' کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ انھوں نے حرف اول اور دیباچے کے بعد ابوطالب کے حالات زندگی بیان کیے ہیں جو کئی نشیب و فراز سے گزرے۔ وہ 1752 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی محمد بیگ خاں اصفہانی عباس آباد اصفہان کے ایک باعزت ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نادر شاہ کے حملوں سے بچنے کے لیے وہ ہندوستان آگئے اور نواب صفدر جنگ کی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد شجاع الدولہ نے ان کے کل اثاثہ واملاک کو ضبط کرلیا تو وہ مرشدآباد چلے گئے۔ کچھ روز بعد ابوطالب بھی بنگال منتقل ہوگئے۔ اس وقت ابوطالب کی عمر چودہ سال کی تھی۔ مرشدآباد ہی میں ابوطالب کی شادی نواب رضا خاں کی عزیزہ سے ہوگئی اور انھیں وہاں کا عامل مقرر کردیا گیا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ ان کے دوست زین العابدین خاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ اس دوران وہ کئی عہدوں پر فائز رہے اور جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے انھوں نے بخوبی انجام دیے۔ ان کی کامیابی سے ان کے دشمن حسد کی آگ میں جلنے لگے لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ اسی زمانے میں اپنے ایک انگریز دوست کپتان رچرڈسن کے ساتھ انھوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ انھوں نے اس سفر کے حالات تفصیل سے قلمبند کیے اور اسے ''سیر طالبی فی بلاد افرنجی'' کا نام دیا۔ اس تصنیف میں انھوں نے یورپ کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان کے ساتھ اس کا موازنہ کیا ہے۔ بعدازاں وہ باندہ کے تحصیلدار مقرر ہوگئے اور 54 سال کی عمر میں وفات پاگئے۔

ابوطالب نے ایک درجن کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی زیرنظر کتاب '' تاریخ آصفی'' میں جس کا ترجمہ مسٹر اسٹوری نے کیا تھا، آصف الدولہ کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی بنیاد ایک روزنامچہ ہے لیکن یہ روزنامچہ کہیں گم ہوگیا۔ اس سے منکشف ہوتا ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں بہت سے ہندو عہدیداران اعلا مراتب پر فائز تھے۔ انھوں نے لکھا ہے آصف الدولہ کو بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرانے کا خبط تھا۔ ہر عمارت جو پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تھی صرف دو روز قیام کرنے کے بعد خالی کردی جاتی تھی۔ اس طرح اس کا وزیر اپنی حرم سرا میں کبوتروں اور دوسرے پرندوں کا گلا گھونٹ کر اپنے ملازموں کو ان کا سوگ منانے کی تاکید کرتا تھا۔ لکھنؤ میں عام لوگوں کو برف نہیں بیچا جاسکتا تھا صرف شاہی محل ہی کو اسے خریدنے کا حق حاصل تھا۔ اسی طرح کیوڑہ اور پھولوں کے بیچنے پر پابندی تھی۔ کتاب میں 1775 سے 1797 تک کے وقائع درج ہیں جو آصف الدولہ کے عہد کا احاطہ کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد عرفان حبیب نے اپنے دیباچے میں ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ابوطالب کی اصل کتاب کی حیثیت کے بارے میں ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے اثر ورسوخ کا سایہ اودھ پر ڈالنا شروع کردیا تھا اور ابوطالب نے ایک برطانوی افسر کرنل رچرڈسن کی تجویز سے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی چنانچہ اکثر و بیشتر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ کی طرح لکھا، سوچا اور برتاؤ کیا ہے۔ ''تفضیح الغافلین'' (جس کا انگریزی ترجمہ 1885 میں ہوئے نے کیا) اس مقدمے کا

ایک جز معلوم ہوتی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے اودھ کے الحاق کے جواز کے لیے بتانا شروع کیا تھا۔"

● **خفیہ کوڈ**

مصنف: سدھا گوئل

مترجم: محمد جمال الدین خاں

صفحات: 32، **قیمت:** 20 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-66

مبصر: فیاض عالم، 102، جوبلی ہال، دہلی یونیورسٹی، دہلی-7

قومی اردو کونسل حکومت ہند کا واحد اردو اشاعتی ادارہ ہے جس نے ادب، فنون لطیفہ، سماجی اور سائنسی علوم اور دیگر مختلف مضامین کی معیاری کتب بڑی تعداد میں شائع کی ہیں۔ کونسل کی کتابیں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگوں کے لیے یکساں افادیت رکھتی ہیں۔ اس ادارے نے جہاں بڑوں کے لیے کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی ہے وہیں بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے بھی بہترین کتابیں شائع کی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "خفیہ کوڈ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"خفیہ کوڈ" کی کہانی کچھ یوں ہے۔ ترون اور مینا کے والد فوجی افسر تھے۔ وہ جب چھٹی میں گھر آئے تو بچوں نے ان سے کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک کہانی سنائی جس میں ایک فوجی کو دشمن فوج نے گرفتار کرلیا تھا۔ اس فوجی نے اس جگہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کوڈ ورڈ (خفیہ زبان) میں اس علاقے کا محل وقوع لکھ کر گرا دیا۔ بعد میں اس کے ساتھیوں نے اس کی مدد سے دشمن فوج پر حملہ کردیا اور انھیں شکست دے کر اپنے ساتھی کو آزاد کرالیا۔

ترون اور مینا کو یہ کہانی بہت اچھی لگی۔ کچھ دنوں کے بعد ترون کو کچھ بدمعاشوں نے اغوا کرلیا۔ وہ بے حد پریشان ہوا۔ اغوا کرنے والوں نے اس کے والد سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ بدمعاشوں نے جب ترون سے اس کے والد کی بات کرائی تو اس نے کوڈ ورڈ میں اس ہوٹل کا نام بتا دیا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ بدمعاشوں کے ساتھ ترون کے والد کو بھی محسوس ہوا کہ وہ خوف زدہ ہوکر ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اور مہمل باتیں کر رہا ہے۔ مینا نے جب ترون کے الفاظ سنے تو اس نے کہا کہ یہ تو وہی کوڈ ورڈ ہے جس میں بہادر فوجی نے اپنے ساتھیوں کو پیغام دیا تھا۔ مینا اور اس کے پاپا اس خفیہ زبان کا مطلب نکال لیتے ہیں اور پولیس کی مدد سے ترون کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کئی نشیب و فراز اور دلچسپ واقعات سے پر یہ کہانی بچوں کے لیے بے حد دلچسپ ہے۔ کتاب کے مترجم قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے انگریزی زبان سے نہایت رواں اردو ترجمہ کیا ہے۔ بچوں کی ذہنی استعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مترجم نے بالکل آسان اور سادہ زبان استعمال کی ہے۔ امید ہے کہ قومی اردو کونسل کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی بچوں کو پسند آئے گی۔

● **سیتاہرن کا تنقیدی جائزہ**

مصنف: ڈاکٹر عائشہ سلطانہ

صفحات: 110، **قیمت:** 25 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی

مبصر: ظہیر رحمتی، ذاکر حسین کالج (شبینہ) جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی

"سیتاہرن کا تنقیدی جائزہ" ڈاکٹر عائشہ سلطانہ کی چوتھی کتاب ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے ناولٹ "سیتاہرن" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اردو زبان بلکہ ہندوستان کی وہ واحد ادیبہ ہیں جن کے طرز نگارش اور طرز فکر نے آفاقی طور پر ہر ذی فہم کو متاثر کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی گہرائی اور گیرائی اور نفسیاتی پیچیدگیوں بالخصوص عورتوں کے مسائل اور نسائی اقدار کے تعین نے فکشن نگاری کو نئی جہت سے آشنا کیا۔ یوں تو قرۃ العین حیدر کی تخلیقات ناقد کی فکر کا محور رہی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر ناقدین کی نظر ان کی چند تخلیقات پر مرکوز رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان تخلیقات کا بھی باقاعدہ اور مفصل مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ "سیتاہرن" قرۃ العین حیدر کا ایک اہم ناولٹ ہے جو اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے نصابی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مذکورہ ناولٹ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب "اردو میں ناولٹ نگاری اور قرۃ العین حیدر کے ناولٹ (مختصر مطالعہ)" میں ناولٹ کی تعریف، اردو میں ناولٹ کی روایت اور قرۃ العین حیدر کے تمام ناولٹوں کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ مصنفہ کے نزدیک ناول داستانوں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ وہ لکھتی ہیں "امتداد زمانہ نے لوگوں کو اس قدر مصروف کردیا کہ اب لوگوں کے پاس طویل داستانیں سننے یا پڑھنے کا بھی وقت نہیں رہا اور داستانوں کا یہی انداز نگارش مختصر ہوکر ناول کی شکل میں نمودار ہوا۔ مصنفہ کی اس رائے سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ مغربی ناقدین کی آرا سے استفادہ کرتے ہوئے ناول، ناولٹ اور مختصر افسانے کے درمیان طوالت و ضخامت کی بنیاد پر فرق و امتیاز قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک "ناولٹ نویسی ایک ایسا فن ہے جو ناول کا حصہ ہونے کے باوجود اس سے الگ بھی ہے لیکن یہ فرق بہت معمولی ہے کیوں کہ ناول کے مقابلے میں مختصر ہونے کے باوجود اس کے پلاٹ، کردار، زمان و مکان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ناول اور ناولٹ میں معمولی فرق ہونے کی وجہ سے ہی اردو کی بہت سی تخلیقات ایسی ہیں جن پر ناول اور ناولٹ دونوں کا

اطلاق ہوتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس راجندر سنگھ بیدی کی تخلیق "ایک چادر میلی سی" کو ناول تسلیم کرتے ہیں جبکہ دوسرے ناقدین اسے ناولٹ قرار دیتے ہیں۔ ناول اور ناولٹ میں فرق و امتیاز قائم کرنا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ ہیئتی حد بندیاں قائم کرنا تدریسی عمل کی بڑی ضرورت ہے ورنہ کوئی بھی ادبی ہیئت اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کو کاٹ کر آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہیئتی فرق و امتیاز داخلی ہیئتی تجزیے کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے، فقط طوالت وضخامت کی بنیاد پر نہیں۔ ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے اس باب میں ناول اور ناولٹ میں فرق و امتیاز قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بعض ناقدین کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ "پلاٹ کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کے ناولٹ کمزور نظر آتے ہیں۔ وہ پلاٹ کی تعمیر میں کرداروں کا سہارا لیتی ہیں جو بہت دور تک کہانی کے پلاٹ کو سنبھال نہیں پاتیں۔

دوسرے باب "سیتاہرن ایک تنقیدی جائزہ" میں ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے قرۃ العین حیدر کے اہم ناولوں، افسانوں اور ناولٹوں کا ذکر کرتے ہوئے "سیتاہرن" پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے نزدیک "سیتاہرن" ایک ایسا ناول ہے جس کی بازگشت تو کافی سنائی دی لیکن اس ناولٹ پر بہت کم لکھا گیا۔ انتظار حسین نے اپنے مضمون میں اس میں پائی جانے والی سماجی اور تاریخی صورت حال پر تو روشنی ڈالی ہے لیکن اس کے کرداروں کے تجزیے سے گریز کیا ہے۔ ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے ماحول، سیاسی و سماجی صورت حال، زبان و بیان اور کرداروں پر بھرپور توجہ دی ہے۔ خاص طور پر کرداروں کے نفسیاتی اور اخلاقی تجزیے پر ان کا زیادہ زور ہے۔ ناولٹ کے تین اہم کردار ہیں: سیتا، جمیل، اور عرفان۔ سیتا ناولٹ کی ہیروئن ہے۔ عرفان کا کردار کہانی کے ارتقا کا حصہ ہے جبکہ جمیل سیتا کے لاشعور میں جاگزیں ہے اور قاری کے سامنے کھل کر نہیں آتا۔ سیتا اپنی کہانی عرفان کو سناتی ہے۔ سیتا ایک آزاد خیال اور عشق پسند خاتون ہے۔ مرد اس کی کمزوری ہے اور جمال پسندی اس کا عیب۔ ڈاکٹر عائشہ سلطانہ کے نزدیک اس ناولٹ کی ہیروئن سیتا کے کردار میں جگہ جگہ اخلاقی گراوٹ نظر آتی ہے۔ انھوں نے بعض ضمنی کرداروں کے توسط سے بھی اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ سیتا نے اپنی تقدیس کو اپنے آپ پامال کیا ہے، عصر حاضر کی سیتا کو ہرنے کے لیے کسی نے زبردستی نہیں کی تھی۔ مغربی تہذیب کی چکاچوند نے آج کی سیتا کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ بہ جبر نہیں لائی جاسکتی تھی۔ اپنے محاکمے میں ڈاکٹر عائشہ سلطانہ کا نقطۂ نظر کلی طور پر مشرقی ہے۔ ان کی ہمدردیاں عرفان اور جمیل کے ساتھ ہیں۔ ان کے مطابق کوئی بھی غیور مرد یا عورت یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ان کی بیوی یا شوہر ان کے علاوہ کسی اور میں دلچسپی لے۔ وہ جمیل کے رویے کی پذیرائی کرتی ہیں۔

سیتاہرن کی کردار نگاری کے ذیل میں ڈاکٹر عائشہ سلطانہ بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ عینی کے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی سیتا کا کردار جو ناولٹ کا مرکزی کردار ہے، مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ اکثر مقامات پر قاری کو سیتا سے ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ مردوں کے ظلم وستم کا شکار ہے لیکن اگلے لمحے یہ ہمدردی زائل ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ضمنی کرداروں ہما، لتا اور بلقیس کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ کردار نگاری کے ساتھ مصنفہ نے عینی کے تاریخی شعور، وسیع مطالعے، منظرکشی، جزئیات نگاری اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی اظہاری قوت پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

● "تمثیل نو" دربھنگہ (خصوصی شمارہ، جلد-7، شمارہ 5-6)

مدیر: ڈاکٹر امام اعظم

صفحات: 208، قیمت: 40 روپے

ناشر: اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ-4

مبصر: فیروز عالم، شعبۂ اردو، فاصلاتی نظام تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد

ماہنامہ "تمثیل نو" دربھنگہ کے اس خصوصی شمارے کا موضوع ہے "پہلی جنگ آزادی (1857) میں اردو زبان کا کردار"۔ ہندوستان کی اس پہلی جنگ آزادی کو 2007 میں ڈیڑھ سو برس مکمل ہوگئے۔ اس موقعے پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مشترکہ طور پر اہل وطن کو پہلی جنگ آزادی میں اردو کی سرگرم حصے داری سے واقف کرانے کا منصوبہ بنایا اور اسی کے تحت دربھنگہ میں 28 اور 29 مارچ 2007 کو دو روزہ کانفرنس منعقد کی گئی۔ کانفرنس کے تین اجلاس منعقد ہوئے جن کے عناوین تھے۔ 1857 سے متعلق دستاویزات اور لسانی و ادبی نقوش؛ "اردو میں مجاہدین قلم کار اور عوام کے وطنی جذبات و خیالات (1857 کے حوالے سے)" اور "اس عہد کی اردو زبان اور ادب پر برطانوی نوآبادیاتی نظام کے منفی اثرات"۔ ان تینوں اجلاسوں میں کوئی تین درجن مقالے پیش کیے گئے۔ رسالے کے زیرنظر شمارے میں ان تمام مقالوں کی تلخیص پیش کردی گئی ہے۔ رسالے میں پہلی جنگ آزادی سے متعلق 67 تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں جو ہمیں بعض ایسے حقائق سے واقف کراتی ہیں جن سے اب تک ہم ناواقف تھے۔

زیر نظر شمارے میں مستقل کالموں کے تحت تنقیدی مضامین، افسانے اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے اسے خصوصی نمبر کے بجائے "پہلی جنگ آزادی اور اردو" پر گوشہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر "تمثیل نو" کے آئندہ کسی شمارے میں وہ تمام مضامین بھی شائع کردیے جائیں جو مذکورہ سیمینار میں پڑھے گئے۔ اس طرح نئی نسل ان بے مثال قربانیوں سے تفصیلی طور پر

آگاہ ہو سکے گی جو اردو کے شعرا، ادبا اور صحافیوں نے ملک کی آزادی کے لیے دیں اور جو بعض وجوہ سے منظر عام پر نہ آسکیں۔

● شام ہوتے ہی

شاعر: راشد انور راشد

صفحات: 128، قیمت: -/150 روپئے

ناشر: خواب پبلی کیشن، ڈریم ہومس اپارٹمنٹ، سرسید نگر، علی گڑھ-202002

مبصر: احمد کفیل، 29- اولڈ برہم پتر ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

''شام ہوتے ہی'' راشد انور راشد کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جو 2007 میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں کل 120 غزلیں ہیں۔ ان میں ابتدائی کچھ غزلیں اس دور کی ہیں جس کی طرف خود موصوف نے اشارہ کیا ہے کہ جب ''مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر''۔ ''اعتراف'' میں انھوں نے لکھا ہے کہ انھیں بچپن سے ہی آرٹ اور شاعری سے والہانہ لگاؤ ہے اور تبھی سے اپنے جذبات کی ترجمانی میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے اور اپنے تصورات میں رنگ و آہنگ بھرنے کا عمل جاری رہا ہے لیکن جیسے جیسے شعور میں بالیدگی آئی اور حیات و کائنات کے حرکت و عمل کو اپنے اندرون میں جذب کرنے کا ہنر سیکھا تو ان کے فن میں بھی پختگی آئی اور ساکت مصوری کی جگہ رواں اور بولتی ہوئی تصویریں ابھرنے لگیں۔'' شاعر کے اس ''اعتراف'' میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ کوئی بھی فن کار جب اپنے فن کو منظر عام پر لانا چاہتا ہے تو اس کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عوام و خواص میں اپنی ایک شناخت قائم کرلے۔ اس کے لیے فن کار مسلسل غور و فکر کے عمل سے گزرتا ہے۔ راشد انور راشد نے بھی اس عمل سے گزر کر اپنے تجربات کا حاصل عام قارئین کے سامنے پیش کردیا ہے۔

راشد انور راشد کے خوابوں اور یادوں کی دنیا بڑی دلچسپ ہے جہاں ان کی آرزوئیں انھی کے سہارے پلتی ہیں۔ انھیں پتہ ہے کہ تمام آرزوئیں حقیقت کا روپ اختیار نہیں کرتیں پھر بھی وہ اپنے محسوسات کو مجسم کردینے کی کوشش کرتے ہیں:

بس یہی سوچ کے یادوں کو تری دے دی پناہ
اس نئے گھر میں کوئی چیز پرانی تو رہے

یہ یادیں اور آرزوئیں انھیں بے چین بھی کرتی ہیں، دن کے پرہجوم ہنگاموں میں ان پر سکوت بھی طاری کردیتی ہیں لیکن شام ہوتے ہی یہی یادیں اور تمنائیں چراغوں کی مانند ان کی راتوں کو اجالوں میں بدل دیتی ہیں۔ راشد کے شعروں میں ایک ایسی فضا اور ماحول ابھرتا ہے جس سے گزرتے ہوئے ایک عجیب کسک اور درد کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کو یہ احساس ہے کہ اس کے خوابوں کی تعبیر ہر لمحہ اسے جھٹلاتی ہے پھر بھی اس خواب و سراب کی دنیا سے اسے ایک خاص انسیت ہے کیوں کہ اسی سے اس کے جذبات کی برف پگھلتی ہے اور ناموافق حالات سے الجھ کر جینے کی ہمت اور توانائی بخشتی ہے:

خاک میں مجھ کو بصد شوق ملا دے لیکن
قطرۂ خوں مرے ہونے کی گواہی دے گا

جہاں بھی ختم ہوئی ہے امید کی سرحد
وہیں سے ہم نے نیا راستہ نکالا ہے

راشد انور راشد کی غزلیں آڑی ترچھی لکیروں سے لے کر شعور فن کے مرحلے تک، ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کی ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے ہی شعری زبان دی ہے۔ کسی شاعر کے فن اور فکر سے متعلق مشہور شاعر اور ناقد مخمور سعیدی نے ایک جگہ کہا ہے:

''شاعری، شاعر کی شخصیت کا پردہ بھی ہو سکتی ہے اور اسے بے پردہ کرنے والی بھی۔ خارج کی زندگی میں وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھ رہا ہے اور اس کے ان مشاہدات کے جو تاثراتی نقش اس کے باطن میں مرتسم ہو رہے ہیں انھیں لفظوں کی گرفت میں لے لینا ہی شاعر کا اصل فن اور اس کی فن کاری کی صحیح پہچان ہے۔ اس کے یہ تاثرات جتنے نازک اور لطیف ہوں گے انھیں معرض اظہار میں لانے کے لیے اتنے ہی نازک اور لطیف الفاظ کا انتخاب شاعر کا فریضہ ہے اور اس فریضے کی ادائیگی میں خود اس کا فنی شعور اور اس کی داخلی کیفیات اس کی رہنما بن جاتی ہے۔''

(سہ ماہی ''لمحے لمحے'' پریہ درشی ٹھاکر نمبر، ص 164)

اس نکتے کے پیش نظر راشد کی غزلیں قابل غور ہیں۔ ابتدائی پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت، حلقۂ یاراں سے مراسم، تعلیمی ترقی، کامیابی و ناکامی کے زیر و بم اور حسرت و مسرت کی داستان ان کی شاعری میں پوشیدہ ہے، جیسے یہ اشعار:

مستقل دید سے پتھر میں بدل جائے گا
اس طرف دیکھنا جب، آنکھ جھپکتے رہنا

پرواز کی ترغیب دلاتے رہے کچھ لوگ
اور کچھ مرے بازو، مرے پر کاٹ رہے تھے

عجیب بات کہ اب تک ضمیر زندہ ہے
بلائیں ٹوٹی تھیں لیکن فقیر زندہ ہے

واقعہ یہ ہے اکیلا پن مجھے راس آگیا
یار لوگوں نے کہا راشد بہت مغرور ہے

تری گرفت میں پھر کیسے آنے والا ہوں
سنبھل کے رہنا کہ میں بھی زمانے والا ہوں

راشد کے شعروں میں جہادِ زندگی کا حوالہ ہو یا عشق و محبت کی کیفیتوں کا بیان، لہجے میں رجائیت ہے اور ولولہ خیزی بھی۔ یہ ولولہ خیزی قاری پر اپنے مثبت نقوش چھوڑتی ہے۔ یہ ہنر الھڑپن سے نہیں جتن اور سنجیدگی سے ہاتھ آتا ہے:

میں زندگی کی نئی فصل بونے آیا ہوں
ضرور دیکھے گی اب موت بھی ٹھہر کے مجھے

انھوں نے جدید شعرا میں بانی اور حسن نعیم کی مشہور زمینوں میں کئی غزلیں کہی ہیں شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ انھیں بانی اور حسن نعیم کا پیروکار سمجھتے ہیں لیکن شعری شریعت میں اس کا اصل مطلب، لفظیات، تراکیب اور معنوی جہات سے ہے نہ کہ زمینوں سے اور اس زاویے سے راشد کے شعری سرمایے کا تجزیاتی مطالعہ کیجیے تو ان کی دنیا جو بھی ہے اپنی ہے، جس میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ ان کی غزلیں ہمیں مطالعے کو اکساتی ہیں:

الگ بناؤں گا میں راہ ساتھ چلتے ہوئے
سفر میں اب کے دکھانا ہے یہ کمال مجھے

● گلہائے چمپا (تذکرۂ شعرائے چمپارن)

مرتب: ظفر کمالی

صفحات: 197، قیمت: 200 روپے

ناشر: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-800004

مبصر: ابوظہیر ربانی، 8- ستلج ہوسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ''گلہائے چمپا'' چمپارن کے شاعروں کا تذکرہ ہے، جس میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز سے عہدِ حاضر تک کے کم و بیش ان تمام شعرا کا احاطہ کیا گیا ہے جو چمپارن میں پیدا ہوئے یا کہیں سے آکر یہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔ اس کتاب میں وہ شعرا بھی شامل ہیں جن کا وطنی تعلق چمپارن سے ہے لیکن جو ترک وطن کر کے کہیں اور جا بسے۔

شعرا سے متعلق کسی عہد کی ادبی تاریخ مرتب کرتے وقت تذکروں کا مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور آنے والی نسل کے لیے اس کی تاریخی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ظفر کمالی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے چمپارن کے شعرا کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس میں شعرائے رفتہ کا تذکرہ حسب تناسب عمر کیا گیا ہے اور اسی تناسب سے زندہ شاعروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے تا کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ زبان و ادب کی تبدیلی کو سمجھا جا سکے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں مرحوم شعرا اور دوسرے حصے میں زندہ شعرا شامل ہیں۔ کل 94 شعرا کے احوال و کوائف، ان کے مجموعے شائع ہوئے ہیں تو ان کے نام اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل بعض شعرا ایسے ہیں جن پر پی. ایچ. ڈی. کے مقالے تحریر کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً سید شاہ محمد مجیب شاہ عظیم آبادی، عبداللہ حامی سیمابی اور صابر کریمی وغیرہ۔ چمپارن میں کئی ایسے استاد شعرا گزرے ہیں جنھوں نے اپنی گلفشانیِ گفتار سے اس سرزمین کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا۔ لیکن ان کی آواز اس محدود خطے میں گھٹ کر رہ گئی اور جو اپنی شہرت و مقبولیت کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ادبی نقطۂ نظر سے ظفر کمالی کا یہ کام بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن کتاب میں بعض ایسی خامیاں بھی در آئی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کے بارے میں کچھ قلم بند کرنے سے پہلے اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ظفر کمالی صفحہ 13 پر رقم طراز ہیں: ''گلہائے چمپا'' ایک تحقیقی و ادبی دستاویز ہے جسے بڑی ژرف بینی اور عرق ریزی سے تیار کیا گیا ہے۔ شعرا کی زندگی کے حالات سے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ان کی نگارشات کی فراہمی میں بڑے حزم و احتیاط اور تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا ہے۔'' لیکن کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں ان ہی چیزوں کی کمی ہے۔ مثلاً صفحہ 71 پر ڈاکٹر شمس الحق خاں کفیل سے متعلق جو معلومات درج ہیں ان میں نمونۂ کلام کے سوا کچھ بھی صحیح نہیں ہے۔ تاریخ پیدائش، جائے پیدائش، ابتدائی تعلیم حتیٰ کہ سالِ وصال بھی غلط ہے۔ کفیل کو ابوالحسن مطلق کا شاگرد بتایا گیا ہے جب کہ انھوں نے مولانا سیماب اکبرآبادی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا جس کی نسبت سے وہ خود کو کفیل سیمابی لکھتے تھے۔ صفحہ 143 پر عبدالمجید خاں مجید کے شعری مجموعوں کے نام ''نغمۂ دل'' اور ''بوند بوند ساگر'' درج ہیں جو صریحاً غلط ہے۔ مجید کا تو ایک ہی شعری مجموعہ ہے اور وہ ہے ''اک آگ سی سینے میں'' اسی طرح دیگر شعرا سے متعلق بھی بہت سی غلطیاں کتاب میں موجود ہیں۔ ادب میں تذکروں کی بڑی اہمیت ہے۔ شاعروں کے کارناموں اور ان کے حالات زندگی کو متعارف کرانے اور منظر عام پر لانے کا یہ موثر ذریعہ ہیں۔ کسی شاعر سے متعلق کوئی غلط بیانی اس وقت اور بھی سنگین ہوجاتی ہے جب کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ غلط العام ہوجاتی ہے۔ کئی جگہ کتابت کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً مزاحیہ شاعر مرزا کھونچ کا نام میر محامد غنی کے بجائے میر مجاہد غنی لکھا ہوا ہے۔ اس طرح کے تسامحات اور زبان و بیان کی غلطیوں نے کتاب کی اہمیت گھٹا دی ہے۔

□□□

عبدالودود انصاری

سائنس کے فدائی

آج کی سائنس جہاں پہنچ چکی ہے اس میں سائنس دانوں کی زبردست قربانیوں کا دخل ہے، آیئے ایسے چند سائنس دانوں سے تعارف حاصل کیا جائے جنھوں نے سائنسی تحقیق و دریافت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دی:

(1) جیورڈانو برونو (Giordano Bruno) یا

فلیپو برونو (Flippo Bruno): آپ کی پیدائش 1548 کو روم میں ہوئی۔ آپ ایک ماہر نجوم، ریاضی داں اور علم الاسرار کے ماہر (Occulist) تھے۔ 1565 میں عیسائی راہبوں میں شامل ہوئے اور 1572 میں پادری مقرر ہوئے۔ آپ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم میں بھی درک رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے بہت سارے سائنسی حقائق کا پتا لگانے میں کامیاب ہوئے۔ 1576 میں آپ نے جب اپنا سائنسی نظریہ پیش کیا تو روم والے آپ سے ناراض ہوگئے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے جب کہ بائبل کے مطابق سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔

برونو جب اپنے نظریے کی تشہیر سے باز نہیں آئے تو انھیں پاپائے روم کے حکم سے جیل میں بند کر دیا گیا جہاں وہ سات سال مقید رہے۔ اس کے بعد ایک مذہبی عدالت منعقد کی گئی جس میں پاپائے روم نے اپنا فیصلہ اس طرح سنایا:

''برونو سخت سزا کا مستحق ہے، اسے موت کے گھاٹ اس طرح اتارا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ پڑے''

جس کا مطلب صاف تھا کہ برونو کو نذر آتش کر دیا جائے۔ کتابوں میں واقعہ اس طرح درج ہے کہ جب اس کے گرد لکڑیاں جمع کرنی شروع کی گئیں تو اس نے چیخ کر سب کے سامنے کہا:

''تم لوگ بھی اس فیصلے سے اتنے ہی خوف زدہ ہو جتنا وہ شخص جس کے خلاف یہ فیصلہ دیا گیا ہے۔''

اہل روم اس حقیقت کو بھول گئے تھے کہ جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ برونو کو موت کے گھاٹ اتارنے کے ساتھ اس کا سائنسی نظریہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ برونو اگرچہ 17 فروری 1600 کو نذر آتش کر دیے گئے مگر کچھ ہی عرصے بعد ان کے نظریات کی بھرپور اشاعت ہوئی اور دنیا حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئی۔

2. گیلی لائی گیلی لیو (Galilei Galileo): آپ کی پیدائش 15 فروری 1564 کو اٹلی میں ہوئی۔ آپ ایک بہت بڑے ریاضی داں، ماہر نجوم اور ماہر طبیعیات تھے۔ آپ نے شروع میں طب کی تعلیم حاصل کی پھر ریاضی کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ آپ اپنی ایجاد ماسکونی ترازو (Hydrostatic Balance) کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہوگئے۔ آپ نے ہی سب سے پہلے دوربین یعنی ٹیلسکوپ (Telescope) ایجاد کی۔ آپ نے ہی بتایا کہ کہکشاں میں کئی ملین ستارے آباد ہیں اور چاند کی سطح ناہموار ہے۔ مشتری (Jupiter) سیارے کی سٹیلائٹ (Satellite) کی اطلاع آپ نے ہی دی۔ آپ ہی وہ سائنس داں ہیں جس نے ارسطو کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مختلف وزن ایک جیسی اونچائی سے زمین پر گرنے میں ایک جیسا وقت لیتے ہیں۔ اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے پیسا کے جھکے ہوئے مینار (Leaning Tower of Pisa) کے 180 فٹ اونچے ساتویں فلور سے دس پاؤنڈ اور ایک پاؤنڈ کے دو گولے ایک ساتھ گرائے۔ دیکھنے والوں میں پروفیسر حضرات اور پیسا یونیورسٹی کے طالب علم بھی تھے۔ دونوں گولے ارسطو کے اصول کے برخلاف ایک ساتھ زمین پر گرے تو دیکھنے والوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ اگر متحرک شے کو ہوا یا فرش نہ روکے تو وہ

کبھی ساکن نہ ہوگی۔ اسی اصول کی مدد سے نیوٹن نے حرکت کے کلیے ترتیب دیے۔ پنڈولم گھڑی کے اصول بھی انھی نے وضع کیے جن کے تحت ان کے بیٹے Vinsenji نے پنڈولم گھڑی بنائی۔

گیلی لیو نے جب اپنے تجربات سے ثابت کردکھانا چاہا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ مرکز سورج ہے اور زمین سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے تو پورا روم ان کا مخالف ہوگیا کیونکہ یہ خیال بائبل کی تعلیمات سے منافی تھا۔

25 مئی 1616 کی تاریخ تھی۔ گیلی لیو کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ جب انھوں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے کوتوال کو پایا جس نے گیلی لیو کے سامنے عدالتی فیصلے کو بلند آواز میں پڑھ کر سنایا: ''......تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے نظریات کی تعلیم سے فوراً باز آجاؤ جو بائبل کے نظریات کے خلاف ہیں اگر تم نے حکم عدولی کی تو پھر......''

گیلی لیو عدالتی فیصلے سے مرعوب نہ ہوا مگر وہ سمجھ ضرور گیا کہ اس بار اسے دھمکی دی گئی ہے لیکن اس کے بعد اسے اور بھی خطرناک مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ گیلی لیو نے اپنے ضمیر سے سودا کرنا گوارا نہ کیا بلکہ حقیقت کا برملا اظہار کرنے کے لیے ایک کتاب "Dialogue Concerning in Two Chief World System (1632)" لکھی جس میں اپنے نظریے کو پوری دلیل کے ساتھ بیان کیا۔ گیلی لیو کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اہل روم کی دشمنی اور بڑھ گئی۔ کتاب کی تمام کاپیاں ضبط کرکے جلادی گئیں۔ مزید اشاعت پر پابندی لگادی گئی اور گیلی لیو کو مجبور کیا گیا کہ وہ اقرار کرے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ غلط لکھا ہے ورنہ سخت سزا کے لیے تیار ہوجائے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گیلی لیو کی عمر ستر سال تھی۔ اب ان میں لڑنے یا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے اور اپنے ناکردہ جرم کا اعتراف اس طرح کیا:

''مجھے معاف کردو۔ میں یقین رکھتا ہوں اور اس پر پختہ یقین رکھوں گا کہ زمین ہی کائنات کا محور ہے۔ مجھے معاف کردو۔ میں یقین رکھتا ہوں اور اس پر پختہ یقین رکھوں گا کہ زمین گردش نہیں کرتی ہے۔''

اس بلند بانگ اعلان کے بعد گیلی لیو نے اپنے دل کو زیر لب یہ کہہ کر سمجھایا کہ میرے کہہ دینے سے زمین اپنی حرکت سے باز نہیں آسکتی وہ تو گھومتی ہی رہے گی۔ گیلی لیو کے اعلانِ توبہ کے بعد ان کی زندگی تو بخش دی گئی مگر انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل کے اندر ان کا سائنسی جذبہ ایک بار پھر شدت سے ابھرا اور چپکے چپکے ایک اور سائنسی کتاب لکھ ڈالی جو کسی طرح جیل کی چہار دیواری سے باہر پہنچ گئی اور ہالینڈ میں شائع ہوئی۔ گیلی لیو کی زندگی کے آخری ایام میں یہ کتاب چھپ کر ضرور آگئی مگر وہ پڑھ نہ سکے کیوں کہ جیل کی کوٹھری کی تاریکی نے ان کی آنکھوں کی ساری روشنی جذب کرلی تھی یعنی وہ اندھے ہوگئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے جسم کی تمام قوتیں بھی سلب ہوچکی تھیں اور اسی حالت میں وہ 8 جنوری 1642 کو دنیا سے رخصت ہوگئے۔

3. انٹونے لیواشے (Antoine Lavoisier): آپ کی پیدائش 26 اگست 1743 کو فرانس میں ہوئی۔ آپ ایک مشہور کیمیا داں گزرے ہیں۔ آپ کو جدید کیمیا کا بانی کہا جاتا ہے۔ آپ نے ہی بتایا کہ پانی، آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں کے مرکب سے بنتا ہے۔ ان دونوں گیسوں کو نام آپ نے ہی دیے۔ آپ نے ثابت کیا کہ ہوا مختلف گیسوں کا مجموعہ ہے۔ آپ نے ہیرے کے ٹکڑے کو جلا کر کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس حاصل کیا اور ثابت کیا کہ ہیرا اور کوئلہ دونوں کاربن کی مختلف شکلیں ہیں۔ آپ نے کیمیا کی بیشتر اصطلاحات وضع کیں جو آج تک زیر استعمال ہیں۔

آپ نے اپنی دلچسپیاں سائنس تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ سیاست سے بھی دلچسپی لی۔ آپ نے انقلاب فرانس میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ آخر عمر میں فرانس کے ایک انقلابی رہنما کے ساتھ لیواشے کا کسی سائنسی مسئلے پر اختلاف ہوگیا۔ دراصل وہ انقلابی رہنما لیواشے کی طرح سائنسی رہنما بھی بننا چاہتا تھا۔ اس نے آگ کی بناوٹ پر ایک کتاب لکھی۔ کتاب ناقص ہونے کی وجہ سے لیواشے نے کھل کر کتاب اور صاحب کتاب کی مخالفت کی۔ یہ بات اس انقلابی رہنما کو بہت بری لگی اور اس نے لیواشے سے بدلہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس

شخص نے اخبارات میں لیواشے کے خلاف اشتعال انگیز مضامین لکھ کر لوگوں کو بدظن کرنا شروع کر دیا۔ لوگ اتنے بدظن ہو گئے کہ لیواشے کو محض 51 سال کی عمر میں بغاوت کا الزام لگا کر 8 مئی 1794 کو موت کی سزا دے دی گئی۔

لیواشےؔ نے مرنے سے پہلے اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھا تھا: ''میں نے کافی لمبی اور خوشی کی زندگی گزاری ہے۔ مجھے بڑھاپے کی بے آرامی سے چھٹکارا ملا۔ میں اپنے پیچھے کچھ علم اور شاید کچھ شہرت چھوڑ چلا ہوں۔ اس سے زیادہ اس دنیا میں اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔''

لیواشے کی موت کے ایک چشم دید مبصر نے اپنی رائے زنی اس طرح کی تھی: ''جس سر کو قلم ہونے میں ایک لمحہ لگا تھا ویسا پھرا ایک سو سال میں نہ بن سکے گا۔''

4. راجر بیکن (Roger Bacon): آپ کی پیدائش 1220 کے قریب انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ آپ پہلے یورپی سائنس داں ہیں جس نے بارود بنانے کا طریقہ معلوم کیا۔ آپ نے موٹر کے ذریعے چلنے والے جہاز (Motorized Ship) کی بناوٹ کا خاکہ پیش کیا۔ آپ ہمیشہ تجرباتی سائنس (Experimental Science) کے حامی رہے۔ آپ نے منطق اور ریاضی پر کتابیں بھی تصنیف کیں۔ فرانس کے راہبوں نے نئی باتیں اور مشکوک خیالات پھیلانے کا الزام لگا کر آپ کو 1277 کے قریب جیل میں قید کر دیا۔ قید کی مصیبت اور تکالیف برداشت کرنے کے بعد 1292 کو انتقال کر گئے۔

5. ارشمیدس (Archimedes): آپ کی پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے پیدائش کے قبل 280-290 کے درمیان یونان میں ہوئی تھی۔ آپ ایک موجد اور ریاضی داں گزرے ہیں آپ نے ارشمیدس اسکریو (Archimedes Screw) ایجاد کی جس کے ذریعے پانی اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ آپ نے (Hydrostatic Principle) پیش کیے جو ارشمیدس کے اصولوں کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے بصریات (Oblics)، میکانیکیات (Mechanics)، نجوم (Astronomy) اور نظریاتی ریاضی (Pure Mathematics) میں گراں قدر اضافے کیے۔ آپ نے چیزوں کے تیرنے کے کلیے (Laws of Floatation of bodies) بھی پیش کیے۔ آپ نے بیرم (Lever) اور چرخی (Pulley) کا استعمال بھی بتایا۔ آپ نے بیرم اور چرخی کے ذریعے ایک بھاری بھرکم پانی کے جہاز کو آسانی سے اٹھا کر دکھایا۔ ارشمیدس کہا کرتے تھے:

''اگر مجھے مناسب جگہ اور مناسب لمبائی کی ایک چھڑ مل جائے جس کے ایک کنارے پر ٹیک لگا ہو تو میں بیرم کا استعمال کر کے اس چھڑ سے زمین کو اٹھا سکتا ہوں۔ آپ نے دائرے کا رقبہ اور اس کے محیط (Circumference) کی پیائش کے فارمولے دریافت کیے۔

یونانی اور روم کے درمیان جب جنگ ہوئی تو یونان روم سے بری طرح ہار گیا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ارشمیدس اپنے گھر میں کمرے کے فرش پر کچھ جیومیٹری کے نقشے بنا رہے تھے کہ اچانک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز رومی فوجیوں کی تھی۔ ارشمیدس اپنے خاکے بنانے میں مگن رہا کہ اچانک اس کے کمرے میں ایک فوجی آ دھمکا۔ فوجی نے ارشمیدس سے کچھ کہا جسے ارشمیدس سمجھ نہ سکا۔ اس پر فوجی اپنے میان سے تلوار نکال کر ارشمیدس کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ارشمیدس کو اپنے کام سے اس درجہ محبت تھی کہ انھوں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے کسی فوجی سے کہا: ''عالی جناب میرے نقشے کو مت مٹانا''۔ ظالم فوجی نے ان کی بات پر کان نہ دھرتے ہوئے ایک ہی وار میں ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ واقعہ غالباً حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے 211 یا 212 سال قبل رونما ہوا تھا۔

□□□

Urdu Medium Govrenment Teachers
Training Institute, P.O. Nalikul-712407
Hooghly, W.B.

جناب وی نرسمہا راؤ

ڈاکٹر کھگیندر ٹھاکر

جناب جی وینکٹ سوامی

جناب زبیر رضوی

جناب کشمیری لال ذاکر

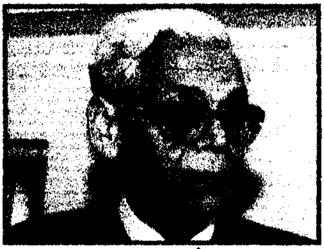

پروفیسر شارب ردولوی

پروفیسر انیس اشفاق

پروفیسر قمر رئیس

Date of Publication : 24/02/2008

URDU DUNIYA Monthly, March 2008, Vol. 10, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

پروفیسر رضا امام

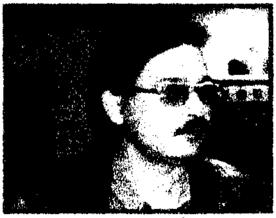
پروفیسر شہاب عنایت ملک

پروفیسر علی احمد فاطمی

ڈاکٹر ارجمند آرا

ڈاکٹر کملا پرشاد

پروفیسر اسلم آزاد

محترمہ اودھیش رانی گوڑ

جناب یوسف غوری

ڈاکٹر فیروز عالم

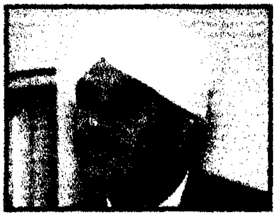
جناب حسن یارندوی

جناب نصرت محی الدین

ڈاکٹر نکہت پروین

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and
printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938